بیاد
شیخ الحدیث حضرت مولانا
محمد سرفراز خان
صفدرؒ

بیاد
شیخ الحدیث حضرت مولانا
صوفی عبد الحمید
خان سواتیؒ

ماہنامہ

الشریعہ

گوجرانوالہ، پاکستان

مؤسس ومدیر
حضرت مولانا ابو عمار
زاہد الراشدی

مدیر منتظم
ناصر الدین خان عامر

جلد ۳۶۔ شمارہ ۸۔ اگست ۲۰۲۵ء

مجلسِ مشاورت

قاضی محمد رویس خان ایوبی۔ ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی۔ پروفیسر غلام رسول عدیم۔
ڈاکٹر سید متین احمد شاہ۔ ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر۔

مجلسِ تحریر

ڈاکٹر محمد زاہد صدیق مغل۔ مولانا سمیع اللہ سعدی۔ ڈاکٹر حافظ محمد رشید۔ مولانا عبد الغنی محمدی۔
مولانا فضل الہادی۔ مولانا حافظ خرم شہزاد۔ مولانا محمد اسامہ قاسم۔ ہلال خان ناصر۔

معاونین

مولانا حافظ کامران حیدر۔ مولانا حافظ شیراز نوید۔ مولانا حافظ دانیال عمر۔ حافظ شاہد الرحمٰن میر۔

الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ، پاکستان

www.alsharia.org — editor@alsharia.org

ناشر: حافظ محمد عبد المتین خان زاہد۔ طابع: مسعود اختر پرنٹرز، میکلوڈ روڈ، لاہور۔

فہرست

ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا 5

مولانا ابوعمار زاہد الراشدی

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر: باقاعدہ سلسلہ کی تکمیل 11

ابو الاعلیٰ سید سبحانی / ادارہ الشریعہ

”خطباتِ فتحیہ: احکام القرآن اور عصرِ حاضر“ (۲) 12

مولانا ابوعمار زاہد الراشدی / مرتب: مولانا ڈاکٹر محمد سعید عاطف

علمِ حدیث کی تاریخ: آغاز و ارتقا 25

ڈاکٹر سید عبد الماجد غوری

”سنتوں کا تنوع“ ۔ ایک تجزیاتی مطالعہ 35

ابو الاعلیٰ سید سبحانی

حدیث میں بیان کی گئی علاماتِ قیامت کی تاریخی واقعات سے ہم آہنگی، بائیبل اور قرآن کی روشنی میں (۳) 43

ڈاکٹر محمد سعد سلیم

”اسلام اور ارتقا: الغزالی اور جدید ارتقائی نظریات کا جائزہ“ (۶) 53

ڈاکٹر شعیب احمد ملک / مترجم: ڈاکٹر ثمینہ کوثر

مسئلہ تکفیر پر چند معاصر کتب 61

ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر

مسلمانانِ عالم کی موجودہ صورتِ حال اور اس کا تدارُک 61

ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

اہلِ سنت کے مقدسات کی توہین حرام ہے..... 69
سید علی خامنہ ای

حد سے تجاوز کی معاشرتی روایات اور اسلامی تعلیمات..... 71
مولانا مفتی محمد / مولانا مفتی طارق مسعود

مولانا محمد فاروق شاہین: ایک ہمہ جہت شخصیت..... 76
مولانا قاری محمد ابوبکر صدیق / مولانا حافظ عزیز احمد

جمعہ کے دن خرید و فروخت اور ہفتہ وار تعطیل کی شرعی حیثیت..... 80
مفتی سید انور شاہ

Ummul-Mumineen Khadija Radhi Allahu Anhaa..... 87
Maulana Abu-Ammar Zahid-ur-Rashdi

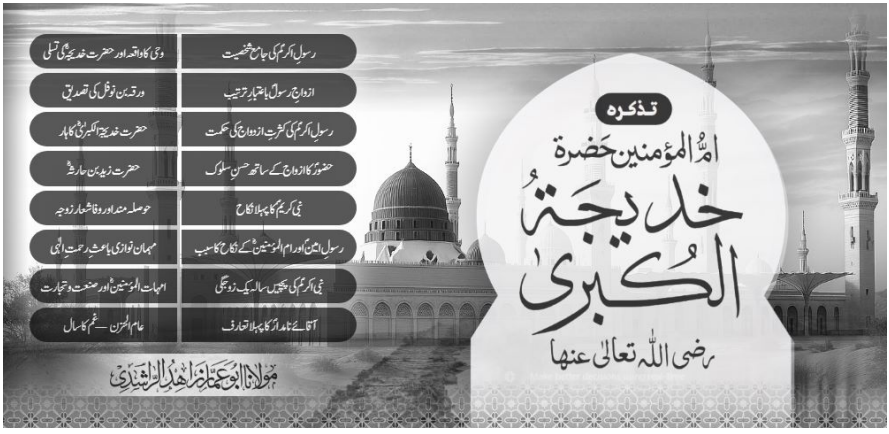

رسولِ اکرمؐ کی جامع شخصیت

جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اس قدر جامع ہے کہ اس میں انسانی زندگی کے ہر کردار کا نمونہ ملتا ہے۔ آپؐ ایک امین بھی تھے کہ مکہ کے لوگ اپنی امانتوں کو آپؐ کے پاس محفوظ رکھتے تھے۔ آپ ایک حکم و منصف بھی تھے کہ عرب قبائل کے درمیان حجرِ اسود کی تنصیب کا معاملہ کس خوش اسلوبی سے طے فرمایا۔ آپؐ تاجر بھی تھے کہ حضرت خدیجہؓ کے تجارتی قافلے دوسرے ملکوں میں لے کر جاتے اور تجارت کرتے تھے۔ آپؐ ایک مبلغ بھی تھے کہ لوگوں کو نیکی اور اچھائی کی طرف بلاتے اور بدی و برائی سے روکتے تھے۔ حق و باطل کی لڑائی میں آپؐ ایسے فوجی کمانڈر بن کر ابھرے کہ اِس پر تاریخ میں مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ رسول اللہؐ منصبِ انصاف پر فائز تھے کہ آپ قاضی اور جج بھی تھے، خود آپؐ کے پاس بھی مقدمات آتے تھے جن کے آپؐ فیصلے سنایا کرتے تھے، اور پھر باقی قاضیوں کے پاس جو مقدمات آتے ان کے فیصلوں پر اپیلیں حضورؐ کی خدمت میں آتی تھیں جن پر حضورؐ فیصلے فرمایا کرتے تھے۔ آپ ایک سیاسی لیڈر بھی تھے کہ مختلف قبائل کے وفود آپ کے پاس آتے تھے جن سے آپ مذاکرات اور گفتگو فرماتے تھے۔ آپ اپنی ریاست کے سب سے بڑے ڈپلومیٹ سب سے بڑے سفارت کار بھی تھے کہ آپؐ دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات اور معاملات کو بھی نبھاتے تھے۔ نبی کریمؐ اپنی ریاست کے منتظم اعلیٰ بھی تھے کہ ریاست کے داخلی معاملات کے متعلق فیصلے بھی آپؐ خود فرمایا کرتے تھے۔ رسول اللہؐ مسجدِ نبوی میں صحابہ کرامؓ کے امام بھی تھے کہ آپؐ نماز خود پڑھاتے تھے۔ جناب نبی کریمؐ ایک خطیب بھی تھے کہ خطبۂ جمعہ اور دیگر خطبات ارشاد فرمایا کرتے تھے۔

یہ میں نے انسانی زندگی کے ان اہم کرداروں میں سے چند کا ذکر کیا ہے جو جناب نبی کریمؐ نے نبھائے۔ پھر ایسا بھی نہیں تھا کہ حضورؐ ایک شعبے میں اچھے تھے اور دوسرے شعبے میں خدانخواستہ کمزور تھے، رسول اللہؐ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر تھے اور افضل الانبیاء تھے، اللہ تعالیٰ نے جو شعبہ بھی حضورؐ کے سپرد کیا اس میں حضورؐ کی کارکردگی کا معیار انتہا پر تھا، یہ جناب نبی کریمؐ کی جامعیت ہے۔[1]

ازواجِ رسولؐ باعتبارِ ترتیب

جناب رسول اللہؐ کی ازواج میں نکاح کی ترتیب کے لحاظ سے حضرت خدیجہؓ، حضرت سودہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت زینب ام المساکینؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت زینب بنت جحشؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، حضرت میمونہؓ اور حضرت صفیہؓ کے نام آتے ہیں۔ رسول اللہؐ کی کل گیارہ بیویاں تھیں جبکہ بیک وقت نو تھیں۔ آنحضرتؐ کی حیاتِ مبارکہ میں آپؐ کی دو بیویاں فوت ہوئیں، ایک حضرت خدیجہؓ اور دوسری حضرت زینب ام المساکینؓ۔[2]

رسولِ اکرمؐ کی کثرتِ ازدواج کی حکمت

جناب نبی کریمؐ کی کل ۱۱ جبکہ بیک وقت ۹ بیویاں تھیں۔ علمائے امت اِس میں ایک حکمت تو یہ بتاتے ہیں کہ اس وقت عرب قبائل کو سیاسی و معاشرتی طور پر اپنے ساتھ جوڑنے کے لیے ان قبائل کے ساتھ یہ ازدواجی رشتے قائم کرنا ایک مؤثر ذریعہ تھا۔ دوسری حکمت یہ بتاتے ہیں کہ اللہ رب العزت نے حضورؐ کے گھر میں مختلف عمروں اور مزاجوں کی عورتیں جمع کر کے خواتین کے متعلق احکام و قوانین کی تعلیم کے بارے میں آپؐ کے لیے سہولت پیدا فرما دی۔ ورنہ جناب نبی کریمؐ نے پچیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہؓ کے ساتھ پہلا نکاح کیا تو اس وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر

چالیس برس تھی۔ ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ پچیس سال تک تنہا آپؐ کی زوجہ محترمہ رہیں اور آپؐ پچاس برس کے تھے جب حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوا۔

حضورؐ کا ازواج کے ساتھ حسنِ سلوک

آپؐ کا اپنی ازواج مطہراتؓ کے ساتھ معاملہ کیسا تھا؟ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہؐ نے سوائے میدان جنگ کے اپنی ساری زندگی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا، نہ کسی بیوی پر، نہ کسی خادم پر اور نہ کسی غلام پر۔ ازواج مطہراتؓ کے ساتھ اپنے طرزِ عمل کی شہادت دیتے ہوئے حضورؐ خود فرماتے ہیں ”خیرکم خیرکم لاھلہ وانا خیرکم لاھلی“ کہ تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہے اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ تم سب سے اچھا ہوں۔ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ میں نے تقریباً دس سال حضورؐ کی خدمت کی۔ حضرت انسؓ ۱۰ سال کی عمر میں حضورؐ کی خدمت میں آئے اور حضورؐ کے وصال کے وقت ان کی عمر ۲۱ برس تھی۔ فرماتے ہیں کہ میں نے ذاتی خادم کی حیثیت سے حضورؐ کی خدمت میں تقریباً دس سال گزارے لیکن کبھی رسول اللہؐ کو کسی پر ہاتھ اٹھاتے نہیں دیکھا۔[3]

نبی کریمؐ کا پہلا نکاح

آپؐ کی پہلی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ قریش کی بڑی باعزت خاتون تھیں۔ وہ ایک تجارت پیشہ اور مالدار خاتون تھیں۔ جب حضورؐ کا حضرت خدیجہؓ کے ساتھ نکاح ہوا تو آپؐ پچیس برس کے جبکہ حضرت خدیجہؓ چالیس برس کی تھیں۔ یہ رسول اللہؐ کا پہلا نکاح تھا جبکہ حضرت خدیجہؓ اس سے پہلے بیوہ ہو چکی تھیں۔ حضورؐ کا حضرت خدیجہؓ کے ساتھ یہ نکاح پچیس برس تک قائم رہا۔ ان پچیس سال کے دوران حضرت خدیجہؓ تنہا حضورؐ کے نکاح میں رہیں۔ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے وقت جناب نبی کریمؐ کی عمر پچاس برس تھی۔ اپنی عمر کے پچیس سے پچاس سال کے عرصے تک حضورؐ نے اور کوئی شادی نہیں کی، حضرت خدیجہؓ حضورؐ کی سب سے لمبی مدت کی بیوی تھیں۔ نبی کریمؐ آخرت وقت تک حضرت خدیجہؓ کو یاد کرتے تھے اور ان کا تذکرہ فرماتے تھے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے کبھی کسی پر رشک نہیں آیا سوائے خدیجہؓ کے، جب بھی کوئی بات ہوتی تو آپؐ فرماتے کہ خدیجہؓ یوں کیا کرتی تھی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ حضورؐ نے کسی بات پر حضرت خدیجہؓ کا نام لیا تو میں بول پڑی کہ یا رسول اللہؐ آپ کیا اس بڑھیا کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ان سے اچھی عورتیں دی ہیں۔ رسول اللہؐ نے اس پر حضرت خدیجہؓ کا دفاع کرتے ہوئے فرمایا کہ خدیجہؓ نے اس وقت میری تصدیق کی جب لوگ مجھے جھٹلاتے تھے، اس نے مجھ پر اپنا مال بھی خرچ کیا اور مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا۔[4]

رسولِ امینؐ اور ام المؤمنینؓ کے نکاح کا سبب

تجارت وہ ناگزیر ضرورت ہے جس کے بغیر انسانی معاشرے کا نظام نہیں چل سکتا، اللہ تعالیٰ نے تجارت کو انسانوں کی معاشی ضروریات پوری کرنے کا ایک ذریعہ بنایا ہے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق زراعت، تجارت، ملازمت، اور مالِ غنیمت، کمائی کے وہ حلال اور جائز طریقے ہیں جن کے ذریعے انسان اپنی ضروریاتِ زندگی مہیا کر سکتا ہے۔ جناب رسول اللہؐ نے تجارت کو کمائی کے بہترین ذرائع میں ارشاد فرمایا ہے، بہت سی روایات ہیں جن میں نبی کریمؐ نے تجارت کی فضیلت و اہمیت ذکر فرمائی ہے، درجات بیان فرمائے ہیں اور تجارت کے متعلق احکامات ارشاد فرمائے ہیں۔ احادیث میں کتاب البیوع کے عنوان سے مستقل کتابیں ہیں اور تجارت و کاروبار کے حوالے سے جناب رسول اللہؐ کی تعلیمات واضح ہیں۔

جناب نبی کریمؐ نے خود بھی نبوت سے پہلے تجارت کو بطور پیشہ اختیار کیا اور اس پر بہت سی روایات ہیں کہ آپؐ لین دین کیسے کرتے تھے اور کاروباری معاملات کیسے طے فرماتے تھے۔ جناب رسول اللہؐ کی بعثت سے پہلے ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ حضورؐ کی شادی کا سبب بھی تجارت ہی تھا۔ حضرت خدیجہؓ قریش کی ایک باعزت تاجر خاتون تھیں اور ان کا تجارتی قافلہ شام کے علاقے میں جایا کرتا تھا۔ وہ خود تو تجارت کے لیے نہیں جاتی تھیں لیکن ان کے نمائندے اور کارندے جاتے تھے۔ تجارت کے سارے عمل کا انحصار صرف نمائندوں پر ہو تو معاملہ اتنا قابلِ بھروسہ نہیں رہتا اس لیے حضرت خدیجہؓ کو تلاش ہوتی تھی کہ کوئی دیانت دار اور قابلِ اعتماد آدمی ان کی تجارت کو سنبھالے۔ جناب نبی کریمؐ کے بارے میں مکہ مکرمہ میں یہ مشہور تھا کہ آپ امین ہیں، صادق ہیں، سچے ہیں، دیانت دار ہیں، بااخلاق اور قابلِ اعتماد ہیں۔

چنانچہ حضرت خدیجہؓ نے یہ دیکھنے کے لیے کہ جو کچھ انہوں نے حضورؐ کے متعلق سن رکھا ہے یہ کہاں تک ٹھیک ہے۔ انہوں نے رسول اللہؐ کو پیغام بھیجا اور پیشکش کی کہ آپ ایک سال میرے تجارتی قافلے کی سربراہی کریں۔ اس پر حضورؐ حضرت خدیجہؓ کا تجارتی قافلہ لے کر شام گئے اور پھر واپس آئے، یہ تجارتی سفر حضرت خدیجہؓ کے حضورؐ پر اعتماد کا باعث بنا اور پھر حضورؐ کے ساتھ حضرت خدیجہؓ کے رشتے کا سبب بھی بنا، یوں آنحضرتؐ کی حضرت خدیجہؓ کے ساتھ نکاح ہو گیا۔ یہ شادی اتنی بابرکت ثابت ہوئی کہ حضورؐ کی بعثت اور نبوت کے اعلان کے بعد حضرت خدیجہؓ کا سارا مال حضورؐ پر ہی خرچ ہوا۔[5]

نبی اکرمؐ کی پچیس سالہ یک زوجگی

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے گھر کا آغاز، جس کو گھر کہتے ہیں، یہ ہوا تھا ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے۔ جب حضورؐ کا نکاح ہوا تو وہاں سے حضورؐ کی گھریلو زندگی کا آغاز ہوا۔ مکہ مکرمہ میں جناب نبی کریمؐ نے حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی حیات میں اور کوئی نکاح نہیں کیا۔ پچیس سال کی عمر میں نبی کریمؐ کا نکاح ہوا تھا، اور پچیس سال ہی ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ کے ساتھ گزارے ہیں۔ گیارہ نبوی میں ان کا انتقال ہوا تھا۔

پہلی بیوی بھی تھیں، بچوں کی ماں بھی تھیں۔ جناب نبی کریمؐ کی ساری کی ساری اولاد، سوائے حضرت ابراہیمؓ کے، حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے تھی۔ چاروں بیٹیاں، بیٹے چار، یا تین، یا پانچ، علیٰ اختلاف الروایات۔ حضرت قاسمؓ کے بارے میں تو آتا ہے کہ حضورؐ کے بیٹے تھے، بلوغت کے قریب پہنچے تھے، تیرہ چودہ سال کی عمر، گھوڑے پر سواری کر لیتے تھے، ان کا انتقال ہو گیا، انہی کی نسبت سے جناب نبی کریمؐ کو ابوالقاسم کہا جاتا ہے، حضورؐ کی کنیت ہے ابوالقاسم، حضرت قاسمؓ کی نسبت سے۔ عبد اللہ بھی نام آتا ہے ایک بچے کا، طاہر بھی آتا ہے، طیب بھی آتا ہے، لیکن جوان کوئی نہیں ہوا۔ جوان بیٹیاں ہوئی ہیں۔ جوان بھی ہوئی ہیں، شادیاں بھی ہوئی ہیں، اولاد بھی ہوئی ہے، نبی کریمؐ نے بیٹیوں کو پالا بھی ہے، بیٹیوں کو عزت بھی دی ہے، بیٹیوں کی اولاد کو بھی پالا ہے، نواسے بھی پالے ہیں۔ پوتا تو حضورؐ کے پاس نہیں تھا لیکن ایک تھا جس کو پوتے کی طرح پالا تھا، اسامہ بن زیدؓ، حضورؐ کے ہاتھوں میں پرورش ہوئی ہے، حضورؐ کے ہاتھوں میں پلے ہیں، اور پوتوں جیسی محبت ہی اسامہ بن زیدؓ کو ملی ہے۔

میں بات حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی کر رہا تھا، میاں بیوی کی وہ محبت اور میاں بیوی کا وہ تعلق پوری دنیا کے لیے مثالی ہے آئیڈیل ہے۔ حضرت خدیجہ الکبریٰؓ مکہ مکرمہ کی بڑی مالدار خاتون تھیں، اور سارے کا سارا مال کس پر خرچ ہوا تھا؟ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ حضور نبی کریمؐ فرمایا کرتے تھے کہ دو آدمیوں کے احسان میں نہیں بھلا سکتا، اپنا سب کچھ مجھ پر نچھاور کر دیا۔ مردوں میں حضرت ابوبکرؓ اور عورتوں میں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ۔

میاں بیوی کا تعلق کیا ہوتا ہے، اس سے اندازہ کیجیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب غارِ حرا میں وحی آئی ہے، اور وہ واقعہ جو زندگی میں پہلا اور انوکھا واقعہ تھا، حضورؐ پر گھبراہٹ طاری ہوئی ہے، حضورؐ کہتے ہیں مجھے اپنے بارے میں ڈر لگنے لگا، تو اس وقت حضورؐ کو سنبھالنے والی کون تھیں؟ حضرت خدیجہؓ۔ بیوی کا یہی کام ہوتا ہے کہ خاوند کی پریشانی میں اضافہ نہیں کرنا، خاوند کی پریشانی میں اس کے کام آنا ہے۔ آئیڈیل بیوی کا یہی کام ہوتا ہے کہ خاوند پریشان ہے مضطرب ہے، حضورؐ کے الفاظ ہیں "انی اخاف علیٰ نفسی" مجھے اپنے اوپر ڈر لگنے لگا تھا غارِ حرا کا واقعہ دیکھ کر۔ اس وقت سنبھالا کس نے ہے، حوصلہ کس نے دیا ہے، صبر کس نے دلایا ہے، ساتھ کس نے دیا ہے؟ ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔

اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ یاد بھی رہی ہیں، یہ مکہ میں فوت ہو گئی تھیں ۱۱ نبوی میں۔ مدینہ جا کر حضورؐ نے اور نکاح بھی کیے۔ ام المؤمنین سیدہ عائشہؓ حضورؐ کی بیویوں میں حضورؐ کو سب سے زیادہ محبوب تھیں، ابوبکرؓ کی بیٹی بھی تھیں، ذہین خاتون تھیں، اللہ تعالیٰ نے بہت کمالات سے نوازا تھا، سوکنیں ان کی بہت تھیں، بیک وقت نو بیویاں تھیں حضورؐ کی۔ کہتی ہیں کہ مجھے کسی پر اتنی غیرت نہیں آتی تھی جتنی اس وقت غیرت آتی تھی جب حضورؐ بار بار خدیجہؓ کا ذکر کرتے تھے، خدیجہؓ ایسے تھی، خدیجہؓ نے یہ کیا، خدیجہؓ نے وہ کیا۔ بخاری شریف کی روایت ہے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے کہا یا رسول اللہ! وہ بڑھیا آپ کو بھولتی نہیں؟ ہر بات پر خدیجہؓ ایسے تھی، خدیجہؓ ایسے تھی، آپ کو اللہ تعالیٰ نے بہت اچھی بیویاں دے دی ہیں۔ اور اچھی تھیں، اس میں کوئی شک نہیں۔ آپؐ جب کوئی ایسی بات ہوتی ہے، خدیجہؓ کی کوئی سہیلی آتی ہے تو کہتے ہیں کہ اسے کھلاؤ پلاؤ، خدیجہؓ خدیجہؓ کرتے رہتے ہیں آپؐ، تو وہ آپ کو بھولتی نہیں ہے؟ تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جملے میں یہ بات کہہ دی، اللہ اکبر، عائشہ! وہ میرے دکھ کے وقت کی ساتھی تھی۔ دکھ کے وقت کا ساتھی کبھی بھولتا ہے؟ وہ تکلیفوں کا دور، وہ آزمائشوں کا دور، وہ طعن وتشنیع کا دور، اذیتوں کا دور، کیسے بھول سکتی ہے۔ تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا آغاز ہوا تھا ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے۔[6]

آقائے نامدارؐ کا پہلا تعارف

سوشل ورک یا انسانی خدمت اور معاشرہ کے غریب و نادار لوگوں کے کام آنا بہت بڑی نیکی ہے اور اسلام نے اس کی تعلیم دی ہے۔ یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مبارکہ ہے اور آپؐ نے دکھی انسانیت کی خدمت اور نادار لوگوں کا ہاتھ بٹانے کا بڑا اجر و ثواب بیان فرمایا ہے۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ آقائے نامدارؐ پر وحی نازل ہونے کے بعد آپؐ کا پہلا تعارف ہمارے سامنے اسی حوالہ سے آیا ہے کہ آپؐ نادار اور مستحق لوگوں کی خدمت میں پیش پیش رہتے تھے۔

چنانچہ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ آنحضرتؐ کا معمول یہ تھا کہ چند دن کی خوراک اور پانی لے کر غارِ حرا میں چلے جاتے تھے اور سب لوگوں سے الگ تھلگ اللہ تعالیٰ کی بندگی میں مصروف رہتے تھے۔ ایک دن وہیں غار میں وحی کے آغاز کا واقعہ پیش آ گیا، حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کو قرآن کریم کی پہلی آیات سنائیں۔

اس واقعہ کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا کیونکہ آپ نے کئی بار سن رکھا ہوگا اور آپ کے ذہن میں ہوگا۔ اچانک یہ واقعہ ہوا، اس سے قبل اس قسم کی بات کبھی نہیں ہوئی تھی اس لیے جناب نبی کریمؐ پر گھبراہٹ کا طاری ہونا فطری بات تھی۔ آپؐ گھر تشریف لائے، چادر اوڑھی اور لیٹ گئے۔ اہلیہ محترمہ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا داناو بینا خاتون تھیں، پریشانی بھانپ گئیں، پوچھا تو آنحضرتؐ نے سارا واقعہ بیان کر دیا اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ ”خشیت علیٰ نفسی“ مجھے اپنے بارے میں ڈر لگ رہا ہے۔ اس پر حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسلی دی اور کہا کہ خدا کی قسم اللہ تعالیٰ آپ کو غمزدہ نہیں کرے گا۔ اور انہوں نے اپنے دعویٰ پر جو دلیل دی وہ یہ تھی کہ ”آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں، ضرورت مندوں کے کام آتے ہیں، مہمانوں کی خدمت کرتے ہیں، لوگوں کی مشکلات میں ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور بے سہارا لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں“۔ گویا ام المومنین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا کہ جو لوگ انسانی سوسائٹی میں دوسروں کے کام آنے والے ہوں اللہ تعالیٰ انہیں غمزدہ اور پریشان نہیں کیا کرتا۔

اس طرح پہلی وحی نازل ہونے کے بعد احادیث کے ذخیرہ میں نبی کریمؐ کا جو سب سے پہلا تعارف ہمارے سامنے آتا ہے وہ ایک سوشل ورکر کی حیثیت سے ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آپؐ بہت بڑے سوشل ورکر تھے اور دکھی انسانیت کی خدمت آپؐ کی سب سے پہلی سنتِ مبارکہ ہے۔[7]

پہلی وحی کا واقعہ اور حضرت خدیجہؓ کی تسلی

جب حضرت جبریل علیہ السلام غارِ حرا میں پہلی وحی لے کر آئے تو یہ حضورؐ کے لیے ایک اچانک بات تھی، آپؐ نے وحی تو قبول کر لی لیکن اِس غیر معمولی واقعہ کی وجہ سے آپؐ کی طبیعت پر بے پناہ بوجھ تھا۔ پہلی وحی کے مراحل سے گزر کر آنحضرتؐ گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے اِس تمام واقعہ کا ذکر کیا، ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ جو جناب نبی کریمؐ کی زوجہ محترمہ تھیں اور قیامت تک دنیا کے مسلمانوں کی محترم ماں ہیں، رسول اللہؐ فرماتے ہیں کہ مجھ پر شخصی احسانات کرنے والی عورتوں میں سب سے بڑھ کر خدیجہؓ تھیں۔

حضرت خدیجہؓ بڑی سمجھ دار خاتون تھیں، حضورؐ نے گھر آکر زوجہ محترمہ کو غارِ حرا کا یہ واقعہ سنایا اور ساتھ ہی پریشانی کا اظہار فرمایا جو کہ ایک طبعی اور فطری بات تھی، اس پر ام المومنین حضرت خدیجہؓ نے پہلا ردِ عمل یہ ظاہر کیا، ”واللہ لا یخزیک اللہ أبدًا“ خدا کی قسم! آپ تسلی رکھیے اللہ تعالیٰ آپ کو تنہا نہیں چھوڑے گا، اس واقعے میں آپ کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر حضرت خدیجہؓ نے اس کی وجہ بیان فرمائی ”انک لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم و تقری الضیف و تعین علی نوائب الحق“ کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس لیے ضائع نہیں ہونے دے گا کہ معاشرے میں آپ کی خدمات اور کارکردگی قابلِ تعریف و ستائش ہیں، آپ صلہ رحمی کرنے والے ہیں، رشتوں کو جوڑنے والے ہیں، ٹوٹے ہوئے رشتوں کو ملانے والے ہیں، بیواؤں اور لاوارث لوگوں کا بوجھ اٹھانے والے ہیں، محتاجوں کو کما کر دینے والے ہیں، مہمانوں کی مہمانداری کرنے والے ہیں اور لوگوں پر آنے والی مشکلات میں ان کی مدد کرنے والے ہیں۔ یعنی جو آدمی سوسائٹی کے حقوق ادا کرتا ہو اور معاشرے کے نادار لوگوں کا سہارا بنتا ہو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو ضائع نہیں کرتے بلکہ اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ ایک نبی کے طور پر جناب نبی کریمؐ کا پہلا تعارف ہی اس بات سے ہوا کہ آپؐ بیواؤں، یتیموں، مسکینوں اور غریبوں کے کام آتے ہیں۔ چنانچہ سماجی خدمت سوسائٹی کا حق ہے، معاشرے کا یہ حق جناب نبی کریمؐ نے خود بھی ادا کیا اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دی۔[8]

ورقہ بن نوفل کی تصدیق

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی وحی نازل ہوئی تو آپؐ کا واسطہ اہلیہ محترمہ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے ذریعے ایک عیسائی عالم سے پڑا۔ بخاری کی روایت کے مطابق آپؐ نے غارِ حرا کا واقعہ ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ سے ذکر کیا اور فرمایا ”خشیت علیٰ نفسی“ مجھے اپنے بارے میں ڈر لگنے لگا ہے۔ حضورؐ کو تشویش تھی، آپؐ نے اپنے خدشے کا اظہار کیا تو ام المومنینؓ نے تسلی دی کہ ”لن یخزیک اللہ ابدًا“۔ اللہ آپ کو تنہا نہیں چھوڑے گا۔ ”لانک تصل الرحم و تحمل الکل و تکسب المعدوم و تقری الضیف و تعین علی نوائب الحق“۔ یہ حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کی سماجی خدمات کا ذکر کیا۔ وہ عیسائی عالم حضرت خدیجہؓ کے چچازاد بھائی تھے۔ ورقہ بن نوفل جو عیسائیت کے عالم تھے، عبرانی زبان جانتے تھے اور انجیل کا عربی میں ترجمہ کر کے لوگوں کو سنایا کرتے تھے۔

حضرت خدیجہؓ نے حضورؐ کو تسلی دی اور آپؐ کو لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں کہ وہ پرانے بزرگ اور عالم ہیں، اس کیفیت کا ذکر ان سے کرتے ہیں، ان سے پوچھتے ہیں کہ یہ کیا معاملہ ہوا ہے، کیا خدشات ہیں۔ وہاں جا کر حضورؐ نے ان کو غار میں پیش آنے والا اپنا واقعہ سنایا، ورقہ بن نوفل چونکہ پرانی آسمانی کتابوں کے عالم تھے، وہ سمجھ گئے کہ یہ نبوت اور وحی ہے۔ کہا، یہ تو وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوا تھا۔ اور پھر خدشے کا اظہار کیا کہ ایک وقت آئے گا کہ لوگ آپ کو پریشان کریں گے اور قوم کے لوگ آپ کو مکہ سے نکال دیں گے۔ اور اس حسرت کا اظہار کیا کہ اے کاش! میں اس وقت موجود ہوں، طاقتور ہوں، تو میں آپ کا ساتھ دوں گا، آپ کی مدد کروں گا۔ اس پر حضورؐ کو تعجب ہوا کہ یہ قوم تو مجھ سے بڑی محبت کرتی ہے، مجھے صادق و امین کہتی ہے، مجھ پر اعتماد کرتے ہیں، میرے پاس فیصلے لاتے

ہیں۔ ”او مخرجی ھم؟“ کیا وہ مجھے مکہ سے نکال دیں گے؟ ورقہ بن نوفل نے کہا آپ جیسی بات جس نے بھی کی ہے اس کے ساتھ یہی ہوا ہے، چونکہ اس وقت تک حضورؐ نے اسلام کی دعوت کا آغاز نہیں کیا تھا تو ورقہ بن نوفل کے ان جذبات کے اظہار پر محققین ان کو اہلِ حق میں سے شمار کرتے ہیں۔ [9]

حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کا ہار

بڑا دلچسپ واقعہ ہے، امام بخاریؒ بیان فرماتے ہیں، بدر میں حضرت زینبؓ حضورؐ کے گھر میں ہیں اور خاوند کا فرقیدیوں میں ہیں، نکاح باقی ہے، نکاح قائم ہے، فدیہ کا فیصلہ ہوا، ابوالعاص بن ربیع کے پاس کچھ دینے ویئنے کو تھا نہیں کہ میں فدیہ میں کیا دوں گا۔ اہلیہ محترمہ گھر میں ہیں، مدینہ منورہ میں، حضرت زینب رضی اللہ عنہا، ان کو پتہ چلا کہ میرا خاوند قیدی ہے، فدیے کا فیصلہ ہوا ہے، فدیے کے پیسے نہیں ہیں، تو اپنا ہار گلے سے اتارا، کسی ذریعے سے بھجوایا کہ ابوالعاص کو دے دو تاکہ اپنا فدیہ ادا کر دے۔ مسلمان بہت بعد میں ہوئے ہیں۔ اپنا ہار دیا کہ جا کر ابوالعاص کو دے دو کہ وہ اپنا فدیہ ادا کر کے رہا ہو جائے گا۔ ابوالعاص نے دیکھ لیا کہ میری بیوی کا ہار ہے، بیوی نے بھیجا ہے۔ تو وہ حضورؐ کی خدمت میں جب پیش کیا، او ہو! حضورؐ کی تو آنکھیں بھر آئیں۔ یہ ہار اصل میں حضرت خدیجہؓ کا تھا۔ ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا ہار تھا جو انہوں نے شادی کے موقع پر بیٹی کو ہدیہ کیا تھا۔ تو حضورؐ کو وہ پرانا دور سارا یاد آ گیا کہ یہ تو خدیجہؓ کا ہار ہے، بیٹی کے پاس ہے، اب بیٹی نے خاوند کو بھیجا ہے آزاد ہونے کے لیے۔ تو حضورؐ نے سفارش کی۔ عام طور پر حضورؐ سفارشیں اس قسم کی نہیں کیا کرتے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ دیکھو بھئی! یہ خدیجہؓ کا ہار ہے، بیٹی کے پاس ماں کی نشانی ہے، اگر تم اجازت دو تو یہ زینبؓ کو واپس کر دوں؟ یا رسول اللہ! حاضر ہے پیش کر دیں۔ [10]

جنگی قیدیوں کے بارے میں حضورؐ کا یہ معمول رہا ہے۔ غزوۂ بدر کے قیدیوں میں حضورؐ کے داماد ابوالعاص بن ربیع تھے جو حضرت خدیجہؓ کے بھانجے تھے، حضرت خدیجہؓ ان کی خالہ بھی تھیں اور ساس بھی، حضرت زینبؓ کے خاوند تھے، قید ہو کر آ گئے تھے۔ بخاری شریف میں ان کا قصہ ہے کہ جب حضرت زینبؓ کو پتہ چلا کہ میرا خاوند گرفتار ہو گیا ہے اور فدیہ کا فیصلہ ہو گیا ہے، اور اس غریب کے پاس دینے کے لیے کچھ نہیں ہے، تو انہوں نے اپنا ہار خفیہ طریقے سے بھجوایا کہ ابوالعاص کو یہ دے دو کہ فدیہ دے کر آزاد ہو جائے۔ اس وقت تک مسلمان اور غیر مسلموں کے نکاح قائم تھے، اس وقت حضرت زینبؓ مدینہ میں ابا جانؐ کے گھر پر تھیں۔ ابوالعاصؓ نے جب وہ ہار حضورؐ کو دیا تو آپؐ پہچان گئے کہ زینبؓ نے اپنا ہار اپنے خاوند کو چھڑانے کے لیے بھیجا ہے۔ ہار دراصل حضرت خدیجہؓ کا تھا جو انہوں نے اپنی بیٹی کو شادی کے موقع پر تحفہ میں دیا تھا۔ حضورؐ نے جب حضرت خدیجہؓ کا ہار دیکھا تو صحابہ کرامؓ سے ارشاد فرمایا کہ یہ بیٹی کے پاس ماں کی نشانی ہے، اگر اجازت ہو تو واپس کر دوں؟ حضورؐ ویسے سوال نہیں کیا کرتے تھے لیکن یہاں یہ بات کی، صحابہ کرامؓ نے کہا جیسے آپ کی رضا۔ چنانچہ وہ ہار حضرت زینبؓ کو واپس کر دیا گیا۔ [11]

حضرت زید بن حارثہؓ

بیع الحر کی ایک اور مثال حضرت زید بن حارثہؓ تھے جو کہ غلام بن کر حضرت خدیجہؓ کے پاس آئے تھے اور حضرت خدیجہؓ نے انہیں حضورؐ کی خدمت میں دے دیا تھا... حضرت زید بن حارثہؓ بھی ایک آزاد خاندان کے فرد تھے راستے میں سفر کرتے ہوئے کسی نے پکڑا اور بیچ دیا، یہ حضرت خدیجہؓ کی ملکیت میں آئے انہوں نے حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ حضورؐ نے انہیں آزاد کر دیا لیکن وہ آزادی کے بعد بھی آپؐ کی خدمت میں رہے۔ حضورؐ نے انہیں متبنّٰی یعنی منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا اور وہ اس وقت تک حضورؐ کے منہ بولے بیٹے رہے جب تک اس کی ممانعت کے احکامات نازل نہیں ہوئے۔ یہ واحد صحابی ہیں جن کا نام قرآن کریم میں ہے۔ [12]

حوصلہ منداور وفاشعار زوجہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی دور میں مصائب و مشکلات میں ان کا سہارا بن کر اور الجھنوں اور پریشانیوں میں مونس و غمخوار بن کر اپنا سب کچھ جناب نبی اکرمؐ کی ذات اور مشن پر لٹا دیا۔ ذرا تصور میں لائیے اس منظر کو جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پہلی بار غار حرا میں وحی کے تجربہ سے دوچار ہوئے، اچانک واقعہ اور وحی جیسا عظیم بوجھ پہلی بار سامنے آیا، گھبراہٹ میں گھر آئے، چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔ سب سے پہلے ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے ہی اس کیفیت کو محسوس کیا۔ دریافت کیا تو نبی اکرمؐ نے واقعہ بیان فرما دیا اور ساتھ ہی کہا کہ مجھے اپنے بارے میں پریشانی ہو رہی ہے۔ یہ حضرت خدیجہؓ تھیں جنہوں نے ایک حوصلہ مند خاتون اور وفاشعار بیوی کی طرح جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ضائع نہیں کرے گا، اس لیے کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، محتاجوں کو کھلاتے ہیں، مشکلات میں لوگوں کا سہارا بنتے ہیں اور ضرورتمندوں کو کما کر دیتے ہیں۔ حضرت خدیجہؓ مالدار خاتون تھیں اور کاروبار میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دیانت سے متاثر ہو کر ہی انہوں نے آپ سے شادی کا فیصلہ کیا تھا، لیکن جب وقت آیا تو اپنا سارا مال اور کاروبار جناب نبی اکرمؐ کے مشن پر نچھاور کر دیا اور مشکلات و مصائب کے اس دور میں آخر دم تک آپ کا ساتھ نبھایا۔ [13]

مہمان نوازی باعثِ رحمتِ الٰہی

مہمان نوازی کے حوالے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہدایات فرمائی ہیں اور حضورؐ کی سنتِ مبارکہ کیا تھی؟ آپؐ کا نبوت کے بعد جو پہلا تعارف ہے وہ مہمان نوازی کے حوالے سے ہے۔ جناب نبی اکرمؐ پر جب غارِ حرا میں پہلی وحی نازل ہوئی تو آپؐ نے یہ واقعہ ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے ذکر کیا اور فرمایا ”خشیت علیٰ نفسی“ مجھے اپنے بارے میں ڈر لگنے لگا ہے۔ آپؐ کو تشویش تھی، حضورؐ نے اپنے خدشے کا اظہار کیا تو حضرت خدیجہؓ نے حضورؐ کو تسلی دی کہ ”لن یخزیک اللہ ابدًا“ اللہ آپ کو تنہا نہیں چھوڑے گا۔ اور پھر انہوں نے آپؐ کی کچھ صفات بیان کیں کہ ان صفات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ آپ کو پریشان نہیں کرے گا، اللہ تعالیٰ اچھے لوگوں کو پریشان نہیں کیا کرتا۔ ان صفات میں یہ فرمایا ”تصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق“ حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کی سماجی خدمات کا ذکر کیا کہ آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں، مصیبت زدہ لوگوں کے کام آتے ہیں، بے سہارا لوگوں کا سہارا بنتے ہیں، مہمانوں کی مہمانی کرتے ہیں۔ ”الضیف“ اس زمانے میں دو قسم کے لوگوں کے لیے بولا جاتا تھا۔ ایک وہ جو کہیں سے ملنے کے لیے آئیں، اور دوسرے بے ٹھکانہ مسافر پر بھی الضیف کا لفظ بولا جاتا تھا۔ پہلے زمانے میں ہوتا تھا کہ مسجد میں مسافر آجاتے اور کہتے میں مسافر ہوں تو لوگ ان کی مہمانی کر دیا کرتے تھے۔[14]

امہات المؤمنینؓ اور صنعت و تجارت

ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ تجارت کیا کرتی تھیں اور جناب رسول اکرمؐ کی ازواج مطہرات میں حضرت ام سلمہؓ، حضرت ام حبیبہؓ اور حضرت زینبؓ اپنے گھر میں کام کرتی تھیں اور مختلف چیزیں تیار کر کے بازار میں فروخت کیا کرتی تھیں۔ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ کی ازواج مطہرات بھی تجارت اور حرفت کے کام کرتی تھیں اور کمائی کیا کرتی تھیں۔ ..... اسلام نے عورت اور مرد کے میل جول کی حدود متعیّن کی ہیں اور پردے و حجاب کے ضابطے نافذ کیے ہیں جن کی پابندی بہر حال ضروری ہے۔ ان حدود کے دائرے میں رہتے ہوئے عورت ملازمت بھی کر سکتی ہے، کاروبار بھی کر سکتی ہے اور جائز کمائی کے دیگر ذرائع بھی اختیار کر سکتی ہے جس کی شریعت میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی طبقہ ملازمت اور کاروبار وغیرہ کے جواز کے نام پر مرد اور عورت کے درمیان اس فطری فرق کی نفی کرنا چاہتا ہے جس کی بنیاد پر اسلام نے مردوں اور عورتوں کے لیے قوانین میں فرق رکھا ہے تو فطرتِ سلیمہ کے طے کردہ اس فرق کو ختم کرنے کی اجازت کسی صورت میں نہیں دی جا سکتی اور نہ ہی عملاً اسے ختم کیا جا سکتا ہے۔[15]

عام الحزن ــــ غم کا سال

حضرت خدیجہؓ اور حضورؐ کے چچا ابو طالب کی وفات قریب قریب ہوئی۔ گھر میں سب سے زیادہ حضورؐ کا ساتھ دینے والی حضرت خدیجہؓ تھیں جبکہ گھر سے باہر خاندان میں سب سے زیادہ محافظ اور مددگار جناب ابو طالب تھے۔ ابو طالب نے اسلام قبول نہیں کیا لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انہوں نے چچا ہونے کے ناطے سے چچا ہونے کا حق ادا کر دیا۔ ابو طالب رسول اللہؐ کے ساتھ شعب ابو طالب میں بھی محصور رہے۔ جناب ابو طالب کی زندگی میں کسی کو حضورؐ کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی، جسے بھی کوئی شکایت ہوتی تو وہ ابو طالب سے کرتا تھا کہ اپنے بھتیجے سے یہ بات کرو، اپنے بھتیجے کو یہ سمجھاؤ۔ ابو طالب کی شخصیت کا ایک رعب اور مقام تھا۔ جس سال کے بعد دیگرے جناب ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوا تو وہ سال حضورؐ کے لیے بہت پریشانی کا تھا کہ عالمِ اسباب میں جو دو بڑے سہارے تھے، دونوں ختم ہو گئے۔ اس لیے رسول اللہؐ نے اسے عام الحزن قرار دیا کہ یہ میرا غم کا سال ہے۔16

حوالہ جات

1) https://zahidrashdi.org/887
2) https://zahidrashdi.org/891
3) https://zahidrashdi.org/885
4) https://zahidrashdi.org/891
5) https://zahidrashdi.org/899
6) https://zahidrashdi.org/3599
7) https://zahidrashdi.org/360
8) https://zahidrashdi.org/884
9) https://zahidrashdi.org/3439
10) https://zahidrashdi.org/3590
11) https://zahidrashdi.org/3265
12) https://zahidrashdi.org/896
13) https://zahidrashdi.org/4866
14) https://zahidrashdi.org/3271
15) https://zahidrashdi.org/1205
16) https://zahidrashdi.org/891

قارئین کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ گزشتہ ماہ ''اردو تراجمِ قرآن پر ایک نظر'' کا باقاعدہ سلسلہ مکمل ہو گیا ہے۔ ہماری اس گزارش کے جواب میں کہ ''کچھ اختتامی کلمات لکھ دیں تو ایک طرح سے 'تتمہ' ہو جائے گا اور یہ سلسلہ بخیر و خوبی پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ''، جناب ابوالاعلیٰ سید سبحانی صاحب نے درج ذیل پیغام ارسال کیا ہے:

''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ بخیر وعافیت ہوں گے

بہت بہت شکریہ آپ حضرات کا کہ دس سال سے زیادہ عرصے تک اس سلسلے کو اپنے موقر رسالے میں جگہ دی۔ سلسلے کی ابھی تکمیل نہیں ہوئی ہے۔ باقی ماندہ وقفے وقفے سے آتا رہے گا۔ باقی بکھرے نکات کو تلاش کرنا اپنے آپ میں ایک بڑا کام ہے۔

جزاکم اللہ خیرا''

ہم محترم ڈاکٹر صاحب اور جناب سید سبحانی صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہمارے قارئین کو اردو تراجمِ قرآن کے تنوع اور ترجمہ کے دقیق اصولوں سے متعارف کرانے کا یہ علمی سلسلہ قائم رکھا۔ یہ تقابلی جائزہ نہ صرف مترجمین کی تعبیراتی ترجیحات کو واضح کرتا ہے بلکہ قرآن کریم کے معانی تک رسائی میں زبان اور اسلوب کی اہمیت کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ اس سلسلہ کی موصول ہونے والی مزید اقساط ان شاء اللہ قارئین کی خدمت میں پیش کی جاتی رہیں گی۔

ادارہ الشریعہ

پیش لفظ

نحمدہ تبارک و تعالیٰ و نصلی ونسلم علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ واصحابہ و اتباعہ اجمعین۔

جامعہ فتحیہ اچھرہ لاہور ہمارے خطے کے قدیم ترین دینی اداروں میں سے ایک ہے جو 1875ء سے دینی تعلیم و تدریس اور عوامی اصلاح و ارشاد کی مساعی جمیلہ میں مصروف چلا آرہا ہے اور مختلف اوقات میں جہاں مشاہیر اہلِ علم و فضل تعلیمی خدمات دیتے رہے ہیں وہاں بہت سی علمی شخصیات نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ یہ ادارہ اپنی تاریخ کے حوالے سے دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، مدرسہ شاہی مراد آباد، اور مدرسہ معین الاسلام ہاٹ ہزاری بنگلہ دیش کے ساتھ قدیم دینی مراکز میں شمار ہوتا ہے۔

جامعہ فتحیہ کے مہتمم حافظ میاں محمد نعمان لاہور کی اہم سماجی و سیاسی شخصیت ہیں اور جامعہ کے نظام میں اپنے اسلاف کی بخوبی نمائندگی کر رہے ہیں، ان کے ارشاد پر مجھے چند سالوں سے جامعہ فتحیہ میں جزوی طور پر تدریسی خدمات میں شرکت کی سعادت اس طرح حاصل ہو رہی ہے کہ ہفتے کے دن کو ظہر کے وقت حاضر ہوتا ہوں اور دورۂ حدیث شریف کے طلبہ کو بخاری شریف اور حجۃ اللہ البالغہ کے چند منتخب ابواب کا درس دیتا ہوں، جبکہ عصر کے بعد عوام الناس سے کسی عمومی موضوع پر گفتگو کا موقع مل جاتا ہے۔ اس دوران مشاورت سے یہ طے ہوا کہ کچھ خصوصی خطبات ''احکام القرآن'' پر دیے جائیں اور عصرِ رواں کے منتخب مسائل کو زیر بحث لا کر انھیں حکمتِ قرآنیہ کی روشنی میں حل کیا جائے، اس پس منظر میں یہ چودہ خطبات دیے ہیں۔

اسلام کے خاندانی نظام کے مختلف پہلوؤں پر بات چیت ہوئی اور دینی مدارس کے کردار و مسائل اور آئندہ حکمتِ علمی پر بھی گفتگو ہوئی، اور کچھ نشستوں میں سرور کائنات ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے کچھ حصوں پر گزارشات پیش کرنے کا

شرف حاصل ہوا۔

جامعہ فتحیہ کے خطیب مولانا محمد سعید عاطف ہمارے قابلِ احترام دوست اور باذوق ساتھی ہیں۔ انھوں نے اس گفتگو کو بہت حد تک مرتب کر دیا ہے جس کا بیشتر حصہ خاندانی نظام کے بارے میں ہے۔ گفتگو تو سادہ اور عوامی سطح کی ہے مگر حافظ صاحب محترم کے حسنِ ذوق نے اسے مستقل کتاب کی شکل دے دی ہے۔ جس میں انھوں نے آیات و احادیث و اقوالِ سلف کی تخریج کے ساتھ ساتھ ضروری مقامات پر وضاحتی نوٹس شامل کیے ہیں اور ان کے علاوہ میرے مختلف اخبارات میں شائع ہونے والے کالموں میں متعلقہ مضامین کو بھی اس کا حصہ بنایا ہے، آخر میں مصادر و مراجع کی فہرست بھی مرتب فرمائی ہے، جو ان کے عمدہ تحقیقی ذوق کی علامت ہے۔ علاوہ ازیں ان خطبات کے آخر میں حافظ سعید صاحب نے میرے ایک پرانے مضمون بعنوان ''انسانی اجتماعیت کے تقاضے اور اسلام کا عادلانہ نظام'' کو بھی شامل کر دیا ہے، اس طرح سے کچھ عصری مباحث پر میری علمی رائے بھی ان خطبات کا حصہ بن گئی ہے (الحمد للہ)

حافظ صاحب موصوف کے شکریہ کے ساتھ تمام احباب سے میری درخواست ہے کہ جامعہ فتحیہ کے بانیان اساتذہ و طلبہ کے ساتھ ساتھ ہم دونوں کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ تادمِ آخر اسی نوعیت کی سرگرمیوں میں مصروف رکھیں اور قبولیت و رضا کے ساتھ انھیں ہمارے لیے ذخیرہ آخرت بنا دیں۔ آمین یارب العالمین۔

مولانا زاہد الراشدی
خطیب مرکزی جامع مسجد، شیرانوالہ، گوجرانوالہ
نزیل جامعہ فتحیہ، اچھرہ، لاہور
12 جولائی 2022ء

قرآن کریم کے معاشرتی احکام اور عصرِ حاضر

خطبہ نمبر 1: مؤرخہ 28 اگست 2016ء (تمہیدی خطبہ)

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علیٰ سید الرسل و خاتم النبیین و علیٰ آلہ و اصحابہ و اتباعہ اجمعین۔ اما بعد!

دینِ اسلام کے حوالے سے اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ موضوعِ بحث اسلام کے بہت سے احکام ہیں۔ ان میں کہیں بحث ہے اور کہیں کشمکش اور اشکالات و شبہات ہیں۔ لیکن آج کی تمہیدی گفتگو میں، میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس کی ضرورت کیا ہے؟ اور ہمارے دل میں کیوں یہ داعیہ پیش آیا کہ ہم اس عنوان کو اپنی گفتگو کے لیے منتخب کریں۔

قرآن کریم کا بڑا معجزہ اس کا محفوظ ہونا ہے

شاہ ولی اللہ نے اس بات پر گفتگو کی ہے کہ قرآن پاک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سب سے بڑا معجزہ ہے اس کے معجزہ ہونے کی بہت سی وجوہ ہیں جنہیں ہم وجوہِ اعجاز کہتے ہیں۔ قرآن پاک کے بیسیوں وجوہِ اعجاز بیان کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن پاک کے اعجاز کا ایک بڑا پہلو یہ ہے کہ قرآن پاک جوں کا توں محفوظ ہے جیسا نازل ہوا تھا ویسا ہی آج الحمدللہ موجود ہے۔ یہ کتابی شکل میں مرتب ہوا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں، پھر اس کے بعد ایک قراءت پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں امت کو یکجا کیا گیا، بعینہ آج وہی قرآن پاک جوں کا توں محفوظ ہے۔

اور باقی سب آسمانی کتابیں نہ تو مکمل طور پر محفوظ ہیں اور نہ ہی مکمل طور پر موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ایک بات عرض کرتا ہوں۔ بائبل بنی اسرائیل کی کتابوں کا مجموعہ ہے، تورات بھی ہے، زبور بھی ہے، انجیل اور اس سے متعلقہ صحیفے بھی ہیں۔ بائبل کے دو حصے ہیں: عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید۔ لاہور میں پاکستان بائبل سوسائٹی، ایک ادارہ ہے اس کے قیام کو ایک سو سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے یہ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے۔ گوجرانوالہ میں کیتھولک عیسائیوں کا بہت بڑا مرکز ہے، یہ تعلیم دیتے ہیں، کتابیں چھاپتے ہیں۔ ان کا گوجرانوالہ سے ایک ماہانہ رسالہ "کلام حق" کے نام سے نکلتا ہے۔ کئی سال تو مجھے پڑھتے ہوئے ہو گئے ہیں۔ کلامِ حق نے آج سے کوئی دس بارہ سال پہلے انارکلی بائبل سوسائٹی کے حوالے سے ایک رپورٹ چھاپی۔ اس میں یہ تھا کہ انارکلی میں جو پاکستان بائبل سوسائٹی ہے، اس نے پاکستان بننے سے پہلے جو انگلش میں بائبل چھاپی تھی 1931ء میں، اس کا اور سن 2001ء میں نئی چھپنے والی کا حوالہ دیا ہے۔

کلامِ حق نے لکھا ہے کہ دونوں ایڈیشنوں میں پینتالیس آیات کا فرق ہے۔ انھوں نے باقاعدہ نقشہ بنایا ہے کہ پہلے یہ لفظ تھا اب نہیں، پہلے نہیں تھا اب ہے، ایک ہی مکتبہ ایک ہی شہر کے دو ایڈیشنوں میں پینتالیس آیات کا فرق ہے۔ تو اس پر میں نے کالم لکھا اور اس پر ایک جملہ کہا کہ ستر سال سے ان کی کتاب میں پینتالیس آیات کا فرق پڑ گیا ہے، اندازہ کریں کہ اس "غریب" کے ساتھ دو ہزار سال میں کیا کچھ ہوا ہو گا۔ یہ میں نے مثال دی ہے۔ الحمدللہ ہمارا قرآن پاک جوں کا توں محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بے نیازی دیکھیے محفوظ بھی کس اہتمام کے ساتھ ہے۔

حضرت سید نفیس شاہ صاحب ہمارے بڑے بزرگ تھے۔ ان کا کتب کے حوالے سے بڑا اچھا ذوق تھا۔ ہم لندن میں اکٹھے ہو گئے، حضرت شاہ صاحب بھی تشریف لے گئے تھے، میں بھی وہاں تھا۔ کتاب کا تھوڑا بہت ذوق میرا بھی ہے، شاہ صاحب کا کتاب کا بہت عمدہ ذوق تھا، مشورہ ہوا کہ انڈیا آفس لائبریری جاتے ہیں۔ ہم شاہ صاحب کی قیادت میں گئے، وہاں مصحفِ عثمانی کا ایک نسخہ موجود ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جو قرآن پاک تھے ان کے چھ سات نسخے لکھوائے گئے تھے جو پوری دنیا میں بھیجے گئے۔ اعلان یہ تھا کہ یہ ایک معیاری (Standard) نسخہ ہے، اپنے نسخے اس

کے مطابق کر لو۔ جس کو ہم مصحفِ عثمانی کہتے ہیں، اس کا ایک اصلی (Original) نسخہ وہاں پر اب بھی موجود ہے۔ میں نے اس کی زیارت کی ہے، اس پر مختلف بادشاہوں کی مہریں بھی لگی ہوئی ہیں۔ شاہ جہاں کی، بادشاہ جہانگیر کی۔

ایک جملہ میں نے پڑھا: ''ھذا مصحف عثمان بن عفان''، یہ مصحف عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا ہے۔ تو میں وہاں سوچنے لگا کہ یا اللہ! تو اپنے قرآن کی حفاظت کن سے کروا رہا ہے، پتہ نہیں اس نسخہ کی حفاظت ہم کر سکتے یا نہ کر سکتے، تو، اللہ حفاظت کن سے کروا رہا ہے اور کہاں کروا رہا ہے۔ انگریزوں سے ظاہراً حفاظت کروائی اور محفوظ طریقے سے انگلستان میں رکھوایا۔ صرف حفاظت ہی نہیں بلکہ اس کی پوری سند لکھی ہے کہ یہ مصحف کس کے پاس تھا، اس کے بعد کسی خلیفہ کے پاس آیا، باقاعدہ ایک مکمل سند موجود ہے کہ یہ نسخہ فلاں فلاں سے ہوتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔

حضرت عثمانؓ کی تلاوت والا نسخہ استنبول میں محفوظ ہے

قرآن پاک کے اعجاز میں سے ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ قرآن پاک جوں کا توں موجود ہے۔ دو نسخے تو پہلے والے موجود ہیں: ایک یہ، اور دوسرا استنبول میں ہے۔ جس نسخے کی تلاوت کرتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تھے اور اس پر خون کے نشانات بھی موجود ہیں، وہ استنبول میں ہے۔ اس کی زیارت کے لیے جانے کا ایک مرتبہ تقاضا ہوا لیکن کسی وجہ سے زیارت نہیں کر سکا۔

حضرت مولانا ضیاء القاسمیؒ اور حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ اور میں، ہم تینوں گئے، راستے میں لندن جاتے ہوئے ہم استنبول ٹھہرے، ہمارا ارادہ تھا کہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزار پر حاضری دیں گے اور مصحف کی زیارت بھی کریں گے۔ مزار پر تو حاضری ہو گئی لیکن قرآن پاک کی زیارت نہیں کر سکے، اتفاق کی بات ہے کہ ان دنوں توپکاپی میوزیم بوجہ مرمت ایک ہفتہ کے لیے بند تھا۔

ایک سروے کے مطابق حفاظ کی تعداد ایک کروڑ تیس لاکھ ہے

وجوہِ اعجاز میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہزاروں نہیں لاکھوں بلکہ لاکھوں سے بھی زیادہ قرآن پاک کے حفاظ موجود ہیں۔ آج (2016ء) سے پانچ سال پہلے امریکہ کے ایک ادارے نے دنیا میں سروے کیا تھا کہ قرآن پاک کے حافظ کتنے ہوں گے، تو رپورٹ چھپی تھی کہ دنیا میں باقاعدہ حافظوں کی تعداد 13 ملین کے لگ بھگ ہے، یعنی ایک کروڑ 30 لاکھ، یہ تو آج سے پانچ چھ سال پہلے تھے، اب یقیناً کم تو نہیں ہوئے ہوں گے بلکہ پہلے سے بھی بڑھ چکے ہیں، تو یہ اس قدر حفاظ کا ہونا بھی قرآن پاک کے وجوہِ اعجاز میں سے ہے۔

قرآن کریم میں معاشی اور معاشرتی مسائل کا حل ہے

قرآن پاک کے اعجاز کے بیسیوں پہلو ہیں۔ امام شاہ ولی اللہ دہلوی نے لکھا ہے کہ آنے والے دور میں سب سے بڑا پہلو یہ ہوگا کہ سوسائٹی کے مسائل کو حل کرنے کے لیے قرآن پاک کیا رہنمائی کرتا ہے، قرآن پاک سوسائٹی کے مسائل کا کیا حل پیش کرتا ہے۔ (الفوز الکبیر: الباب الثالث الفصل الرابع فی وجوہ اعجاز القرآن الکریم، مکتبۃ البشریٰ، کراچی، 2011ء، ص86)

اس پر شہادتیں موجود ہیں، کھلی شہادتیں، دستاویزی شہادتیں، لوگ قرآن پاک کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ ان میں دو واقعات عرض کرنا چاہوں گا:

پاپائے روم اس وقت پوپ فرانسیس ہیں۔ اس وقت (جب) اس سے پہلے پوپ بینی ڈکٹ پاپائے روم تھے، انھوں نے دنیا کے معاشی بحران کو ختم کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی تھی، اس کی رپورٹ یہ تھی کہ دنیا کے معاشی نظام میں بیساکھیوں کے سہارے مزید چلنے کی سکت نہیں رہی۔ دنیا کو معاشی انصاف فراہم کرنا ہے تو وہ معاشی اصول اپنانے ہوں گے جو قرآن پاک نے انسانیت کو دیے ہیں۔

جبکہ پولوشن اور ماحولیاتی آلودگی کے حوالے سے نیویارک کی ایک کانفرنس میں شہزادہ چارلس نے بھی اس قسم کی بات کی تھی۔ اس کا ایک جملہ عرض کرتا ہوں، اس نے کہا کہ دنیا میں جو آلودگی (Pollution) ہے وہ سائنسدانوں کی پھیلائی ہوئی ہے۔ وہ ان سائنسدانوں سے لڑتا ہے کہ تم یہ ٹھیک نہیں کر رہے، اس کے لیکچر کا یہ خلاصہ ہے جو اس نے نیویارک میں دیا تھا۔ اس نے کہا کہ دنیا کو اگر تباہی سے بچانا چاہتے ہو تو تمھیں وہ معاشرتی اصول اپنانے ہوں گے جو قرآن نے دیے ہیں۔ سماج کے، زندگی کے، فطرت کے، جو قرآنی قوانین ہیں وہ اپنانے ہوں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی قرآن کے بارے میں پیشین گوئی

حضرت شاہ ولی اللہ نے فرمایا تھا کہ آنے والے دور میں قرآن پاک کے اعجاز کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہوگا کہ قرآن اور قرآن کے بیان کردہ احکام، قرآن کی بیان کردہ شریعت، سوسائٹی کا سسٹم، سماج کا نظام، یہ دنیا کو ماننا پڑے گا کہ سب سے بہتر نظام ہے۔ اور مسلمانوں کے اہلِ علم کو اس پر کام کرنا ہوگا کہ سماج کے مسائل پر، سوسائٹی کی مجبوریوں پر، معاشرے کی مشکلات پر قرآن پاک کیا رہنمائی کرتا ہے، اور جس طرح قرآن رہنمائی کرتا ہے اس طرح رہنمائی کریں۔ شاہ صاحب یہ بات تین سو سال پہلے فرما گئے تھے، دنیا پر یہ بات اب واضح ہو رہی ہے۔

ولی اللّٰہی اسلوب بیان کے بارے میں چند نومسلموں کی رائے

امریکن نومسلم خاتون ہیں ڈاکٹر ایم کے ہرمینسن صاحبہ، اس پر کام کر رہی ہیں، انھوں نے دینی علم پڑھا ہے۔ اس خاتون نے حضرت شاہ ولی اللہ پر پی ایچ ڈی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے بھی کام لے رہے ہیں۔ شکاگو یونیورسٹی کی شاہ ولی اللہ

چیئر کی چیئر پرسن ہیں، وہاں بیٹھی کام کر رہی ہیں، گوجرانوالہ میں ایک مرتبہ ہمارے ہاں تشریف لائی تھیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ مغرب سے اگر اسلام کی بات کہنا چاہتے ہو تو شاہ ولی اللہ کی زبان سے کہو، ان کے اسلوب میں کہو۔

برطانیہ میں ایک نومسلم ڈاکٹر یحییٰ برٹ بھی اسی پر کام کر رہا ہے، اس کا کہنا یہ ہے کہ دنیا سے اگر اسلام کی بات کرنی ہے تو شاہ ولی اللہ سے اِس کے انداز سیکھو اور ان کی زبان سیکھو۔

کچھ عرصہ قبل گوجرانوالہ میں ایک نومسلم ملائیشیا سے تشریف لائے جو ایک بڑے بدھ مذہبی راہنما کے فرزند ہیں۔ انھوں نے اٹھارہ سال اسلام کا مطالعہ کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ کے علوم کا انگریزی میں ترجمہ بھی کر رہے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر آج کی جدید دنیا سے اسلام کی بات کرنی ہے تو شاہ ولی اللہ کا اسلوبِ بیان سیکھو ورنہ دنیا سے اسلام کی بات نہ کرو۔

دانائی کی زبان، حکمت کی زبان، لوگوں کے مسائل کے پس منظر اور ضروریات کی بات۔ میں مشرق و مغرب دنیا میں بہت سے نومسلموں کی مثالیں دے سکتا ہوں جن سے میری ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ اب دنیا کہہ رہی ہے کہ شاہ ولی اللہ کو سمجھو، شاہ ولی اللہ کی بات کرو، ان کے لہجے و اسلوب میں بات کرو۔ جبکہ شاہ ولی اللہ یہ کہتے ہیں کہ قرآن پاک میں اپنے حوالوں سے ضرور باتیں کرو لیکن قرآن پاک کی بات سماج کے حوالے سے بھی کرو۔

قرآن کریم کے پیش کردہ نظام کے مقابل کوئی نظام نہیں

یہ قرآن پاک کا چیلنج ہے:

وإن كنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتوا بسورة من مثله وادعوا شهداءكم من دون الله ان كنتم صادقين (سورۃ البقرۃ 2، آیت: 23)

(اور اگر تم اس (قرآن) کے بارے میں ذرا بھی شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر اتارا ہے تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا لاؤ۔ اور اگر سچے ہو تو اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو۔)

ایک آیت اور ایک سورت کا مقابلہ تم نہیں کر سکتے۔ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ پچھلے زمانے میں ان آیات کا مفہوم یہ سمجھا جاتا تھا کہ فصاحت میں بلاغت میں، لیکن آنے والے دور میں اس چیلنج کا ترجمہ یہ ہوگا کہ قرآن پاک نے اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی سوسائٹی کی مشکلات کے حل کے لیے جو قانون اور ضابطے دیے ہیں ان جیسا ایک قانون لا کر دکھاؤ۔ قرآن پاک کے معاشرتی احکام، سنتِ رسولؐ کے معاشرتی احکام، اور اسلام کا جو سماجی نظام ہے، ان میں سے کسی ایک کے ضابطے اور قوانین میں سے کسی ایک کا مقابلہ کر کے دکھاؤ۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی ایک تحریک یہ تھی کہ قرآن کی بات کرو، معاشرتی مسائل کے حوالے سے سماج کی مشکلات کے حوالے سے جو لوگوں کو مشکلات درپیش ہیں ان کو سامنے رکھو، قرآن اور سنتِ رسولؐ سے استنباط کر کے اس کا حل پیش

کرو۔

آج کی بڑی ضرورت، قرآن سے معاشرتی مسائل کا حل پیش کرنا ہے

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ آج کی سب سے بڑی ضرورت قرآن مجید سے معاشرتی مسائل کا حل پیش کرنا ہے۔ مجھے پڑھتے پڑھاتے ہوئے دورِ طالب علمی میں ساٹھ سال ہو گئے ہیں اسی میں وقت گزارا ہے اور اسی طرح آخر تک وقت گزارنے کا ارادہ ہے، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔ زندگی بھر کا تجربہ یہی ہے کہ قرآن پاک کے اعجاز کے سارے پہلوؤں پر بات کریں۔ آج کی ضرورت یہ ہے، سماج کے حوالے سے جو انسانی مشکلات درپیش ہیں، معاشرے کے جو مسائل ہیں، ان مسائل کے حل کے لیے قرآن پاک اور جناب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مبارکہ کیا کہتی ہے، اس حوالے سے قرآن پاک کو پڑھا جائے، سمجھا جائے، پیش کیا جائے اور دنیا کو بتایا جائے کہ لوگوں کے مسائل کا حل اس دنیا کے بتائے ہوئے سسٹم میں نہیں ہے بلکہ قرآن پاک میں ہے۔

سماج اور وحی الٰہی کا باہمی تعلق

ہماری دنیا کے آج کے سماج کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کیا مذہب اور ریاست کا کوئی باہمی تعلق ہے؟ یہ آج کے سماج کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ سماج اور وحی کا باہم کوئی تعلق ہے؟ معاشرے کا اور آسمانی تعلیمات کا ایک دوسرے سے کوئی رشتہ ہے؟ اور ہے تو کس لیول پر ہے؟ میں عرض کرتا ہوں کہ سماج کا آغاز کہاں سے ہوا اور کیسے ہوا، قرآن پاک کیا کہتا ہے؟ قرآن پاک سے پوچھ لیں کہ انسانی سوسائٹی کا آغاز کہاں سے ہوا؟ انسانی سوسائٹی کا آغاز ایک جوڑے سے ہوا۔ اللہ جل شانہ نے جنت میں فرمایا تھا:

وقلنا یا اٰدم اسکن انت و زوجک الجنۃ

(اے آدمؑ تم اور تمھاری بیوی جنت میں رہو۔)

تم اور تمھاری بیوی جنت میں رہو، یہ سماج کا آغاز ہے۔ پھر ان پر ایک پابندی لگا دی:

وکلا منھا رغدا حیث شئتما ولا تقربا ھذہ الشجرۃ (سورۃ البقرہ 2، آیت: 35)

(اور اس میں سے جہاں سے چاہو جی بھر کے کھاؤ مگر اس درخت کے پاس بھی مت جانا۔)

کیا مطلب؟ یعنی سوسائٹی مکمل آزاد نہیں ہے بلکہ جائز اور ناجائز کی پابندیوں کے ساتھ ہے۔ سوسائٹی ہر لحاظ سے آزاد نہیں ہے بلکہ پابندیوں کے حصار میں ہے۔ میں دو باتیں عرض کیا کرتا ہوں: (1) انسانی سوسائٹی کا آغاز فرد سے نہیں جوڑے سے ہے (2) انسانی سوسائٹی کا آغاز پابندیوں سے ہے۔ یہ انسانی سوسائٹی کا آغاز اور زیرو پوائنٹ ہے کہ یہ کھانا ہے اور یہ نہیں کھانا، یہ پابندی تھی۔ انھوں نے درخت سے کھا لیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا، نقل مکانی کرو (ہجرت کرو) چلو زمین کی طرف۔

اھبطوا منھا جمیعا

(اب تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔)

حکم تو ہو گیا کہ جنت سے اتر جاؤ، زمین پر جاؤ، دو باتیں اللہ رب العزت نے اس موقع پر ارشاد فرمائیں:

ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین

(اور تمھارے لیے ایک مدت تک زمین میں ٹھہرنا اور کسی قدر فائدہ اٹھانا (طے کر دیا) گیا ہے)

(یہ میں سماج کا آغاز بیان کر رہا ہوں) کہ زمین پر اتر جاؤ وہاں رہنے کی جگہ بھی ہو گی اور کھانے پینے کا بندوبست بھی ہو گا، روٹی کپڑا مکان بھی ہو گا۔ ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ ایک مدت متعیّن ہے۔ کسی کا زمانہ چالیس سال، کسی کا پچاس سال، ساٹھ سال، نوے سال۔ کرنا کیا ہے؟ صرف زمین پر نہیں بھیج رہا بلکہ:

فاما یاتینکم منی ھدی فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون والذین کفروا و کذبوا بأیتنا اولٰئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون (سورۃ البقرہ 2، آیت: 38)

(پھر اگر میری طرف سے کوئی ہدایت تمھیں پہنچے تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کو نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ کسی غم میں مبتلا ہوں گے۔ اور جو لوگ کفر کا ارتکاب کریں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے وہ دوزخ والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انسان کو ہدایات میں دوں گا اور میں بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے۔ جس نے میری ہدایت کی پیروی کی جو میری ہدایت (Direction) پر چلا، وہ تو خوف اور غم سے نجات پائے گا اور اپنے گھر جنت میں واپس آئے گا۔ اور جس نے میری ہدایت پر عمل نہیں کیا وہ دوسرے گھر جائے گا (یعنی جہنم میں)۔

والذین کفروا و کذبوا بأیتنا اولٰئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون (سورۃ البقرہ 2، آیت: 38، 39)

(اور جو کفر کا ارتکاب کریں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے وہ دوزخ والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔)

یہ ہے انسانی سوسائٹی کا نقطہ آغاز، یہ ہے زیرو پوائنٹ، تو قرآن نے انسانی سوسائٹی کا آغاز یہاں سے بیان کیا ہے اور ایک جگہ فرمایا:

وبث منھما رجالا کثیرا ونساء (سورۃ النساء 4، آیت: 1)

(اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں (دنیا میں) پھیلا دیے۔)

ساری سوسائٹی کا پھیلاؤ ان دونوں سے یعنی حضرت حوا اور حضرت آدم علیہ السلام سے ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ بات کہنا کہ سوسائٹی کا سماج کا آسمانی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں، سماج خود مختار ہوتا ہے، سماج اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہوتا ہے۔ قرآن اس بات کو تسلیم نہیں کرتا، قرآن پاک کیا کہتا ہے؟ بھیجا بھی میں نے ہے، بکھیرا، پھیلایا بھی میں نے ہے، مستقر (دنیا کا ٹھکانہ) بھی میں نے دیا ہے، اور متاع (وسائلِ زندگی) بھی میں نے دیے ہیں، اور ہدایات بھی میں دوں گا۔ سماج کا یہ آغاز قرآن کا بیان کردہ ہے۔

نسلِ انسانی کے آغاز کے بارے میں مغربی نظریہ اور قرآنی موقف

ہمیں مغربی نظامِ فکر سے متاثر ہو کر انسانی سوسائٹی کا آغاز یوں پڑھایا جاتا ہے، وہ یہ کہ انسان جانوروں کی طرح جنگل میں رہتا تھا اور آہستہ آہستہ انسانی سوسائٹی میں شعور آیا لباس کا، قانون اور تعلیم کا، سوسائٹی آہستہ آہستہ خود پیش رفت کر کے آگے بڑھی۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید سے پوچھو کہ قرآن کیا کہتا ہے، یہ علم اور تعلیم سوسائٹی کے ارتقاء کا نتیجہ ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو پہلے کیا کیا؟

وعلم اٰدم الاسماء کلھا (سورۃ البقرۃ 2، آیت: 31)

(اور آدم علیہ السلام کو (اللہ نے) سارے نام سکھا دیے۔)

یہ علم وہبی (اللہ کی طرف سے عطا کردہ) ہے۔ آدم علیہ السلام کو سب سے پہلے کیا سکھایا تھا؟ درمیان میں ایک لطیفہ عرض کر دیتا ہوں۔ ایجوکیشن کا زیرو پوائنٹ بھی یہی ہوتا ہے، نام سکھائے جاتے ہیں۔ کسی بھی زبان کو آپ دیکھ لیں اس کے سکھانے کی ابتدا ناموں سے ہوتی ہے۔ یہ بکری ہے، یہ گائے ہے، آغاز ناموں سے ہوتا ہے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ میں نے سکھایا تھا۔

الرحمٰن علم القرآن، خلق الانسان، علمہ البیان (سورۃ الرحمٰن 55، آیت: 1-4)

(وہ رحمٰن، جس نے قرآن کی تعلیم دی۔ اس نے انسان کو پیدا کیا۔ اسی نے اس کو بیان کرنا سکھایا۔)

دوسری جگہ فرمایا:

وعلم اٰدم الاسماء کلھا (سورۃ البقرۃ 2، آیت: 31)

(اور آدمؑ کو (اللہ نے) سارے نام سکھا دیے۔)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہبی علم دیا ہے، اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کو اس کا بنیادی اور ضروری علم وہبی (فطری) طور پر دیا ہے، کسبِ عمل بعد میں ہے، اس میں بتدریج ترقی ہوتی ہے اور توسع ہوتا ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال دوں گا، ساری چیزیں انسان کسب (ذاتی علم، جدوجہد) سے حاصل نہیں کرتا۔ بنیادی چیز وہبی ہوتی ہے، آگے کسب سے انسان ترقی کرتا ہے۔

دیکھیں بچہ پیدا ہوا ہے، پیدا ہونے سے پہلے ماں کے پیٹ میں اس کی خوراک کا راستہ ناف تھا، پیدا ہوتے ہی ناف کاٹ دیتے ہیں۔ بچے کو بھوک لگتی ہے، منہ مارتا ہے، ماں کا سینہ تلاش کرتا ہے۔ اس کو یہ کس نے بتایا؟ کس نے بتایا کہ مجھے خوراک یہاں سے ملنی ہے۔ حالانکہ پہلے یہاں سے خوراک کبھی نہیں ملی لیکن منہ بلا رہا ہے، ماں کا سینہ تلاش کر رہا ہے کہ کہاں سے دودھ ملے گا؟

ایک منظر اور دیکھیں آنکھ میں خارش ہوئی ہے، بچہ کیا کرتا ہے؟ ہاتھ کی پشت سے خارش کرتا ہے، آپ نے اس کو خارش کرتے ہوئے دیکھا ہے، تو اس کو یہ کس نے بتایا ہے؟ میں نے آپ کو یہ چھوٹی سی مثال دی کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس کی ضرورت کا علم فطری طور پر دیا ہے یعنی بنیادی علم انسان کے پاس وہبی ہے۔

انسانی ضروریات (روٹی، کپڑا، مکان وغیرہ) کا آغاز قرآن کی روشنی میں

یہاں ایک عجیب بات کہی جاتی ہے کہ انسان جنگلوں میں ننگا رہتا تھا، اس نے تدریجاً ترقی کی اور وہ مرحلہ بہ مرحلہ آگے بڑھا، اسے آہستہ آہستہ شعور میسر آیا۔ جبکہ قرآن کہتا ہے کہ جنت میں جب آدم اور حوا علیہما السلام نے درخت سے پھل کھایا تو

بدت لهما سواتهما وطفقا يخصفان عليهما من ورق الجنة (سورۃ الاعراف 7، آیت: 22)

(تو ان دونوں کی شرم کی جگہیں ایک دوسرے پر کھل گئیں اور وہ جنت کے کچھ پتے جوڑ جوڑ کر اپنے بدن پر چپکانے لگے۔)

جنت کا لباس چونکہ اتر گیا تھا اس لیے بے ساختہ درختوں کے پتے توڑ توڑ کر اپنے وجود کو چھپانے لگے۔ یہ فطرت ہے، نیچر (Nature) ہے۔ انسان کا لباس ان کے پاس تھا، لباس کوئی تعلیم اور ڈپلومہ حاصل کر کے تو انھوں نے نہیں بنایا تھا۔ ان کی پاکیزہ فطرت میں لباس بھی تھا اور اس کی اہمیت کا احساس بھی تھا۔ اور قرآن پاک نے ہمیں بھی یہ سبق دیا ہے:

يا بنى اٰدم لا يفتننكم الشيطان كما اخرج ابويكم من الجنة ينزع عنهما لباسهما ليريهما سواٰتهما (سورۃ الاعراف 7، آیت: 27)

(اے آدمؑ کے بیٹو اور بیٹیو! شیطان کو ایسا موقع ہرگز ہرگز نہ دینا کہ وہ تمھیں اسی طرح فتنے میں ڈال دے جیسے اس نے تمھارے ماں باپ کو جنت سے نکالا، جبکہ ان کا لباس ان کے جسم سے اتروا لیا، تاکہ ان کو ایک دوسرے کی شرم کی جگہیں دکھا دے۔)

پورا فلسفہ بیان کر دیا قرآن پاک نے کہ دیکھو! تمھارے باپ دادا کو شیطان نے ورغلایا تھا اور بے لباس کر دیا تھا، کہیں تمھیں بھی یہ شیطان لباس سے محروم نہ کر دے۔ قرآن کہتا ہے کہ تمھارے باپ آدم اور اماں حواء علیہا السلام کا لباس کس

نے اتروایا تھا؟ شیطان نے۔ کہاں اتروایا تھا؟ جنت میں۔ تمھیں بھی گمراہ کرنے پر آئے گا تو سب سے پہلے لباس اتروائے گا۔ قرآن پاک ہمیں خبردار کر رہا ہے۔ شیطان نے وہاں بھی یہی حربہ اختیار کیا تھا۔ اور زمین میں سوسائٹی کو خراب کرنے کے لیے بھی یہی حربہ استعمال کرے گا اور لباس اتروائے گا، بے حیا بنائے گا۔ لباس نیچر کا حصہ ہے لیکن پھر بھی یہ کہا جاتا ہے کہ انسان جنگل میں جھونپڑیوں میں رہتا تھا، وہاں سے ہوتے ہوئے کچے کوٹھے تک پہنچا۔ اس بارے میں قرآن کیا کہتا ہے:

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ (سورۃ آل عمران 3، آیت: 96)

(حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلا گھر جو لوگوں (کی عبادت) کے لیے بنایا گیا یقینی طور پر وہ ہے جو مکہ میں واقع ہے۔)

پہلا بیت یا گھر کہاں بنا تھا؟ کب بنا تھا؟ مکہ میں کس نے بنایا تھا؟ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے بنایا ہے زمین پر۔ جناب باری تعالیٰ کی بارگاہ میں دونوں آدم و حوا علیہ السلام اپنے رب سے معافی مانگتے رہے:

ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا و ترحمنا لنکونن من الخاسرین (سورۃ الاعراف 7، آیت: 23)

(اے ہمارے پروردگار! ہم اپنی جانوں پر ظلم کر گزرے ہیں، اور اگر آپ نے ہمیں معاف نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم نامراد لوگوں میں شامل ہو جائیں گے)

پھر جب معافی مل گئی تو فرمایا کہ زمین کو تمھارا منفرد گھر بنایا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے انسان کو شعور بہت دیر بعد آیا۔ دیکھیے قرآن پاک سماج کا آغاز کہاں سے کر رہا ہے اور کیسے بیان کر رہا ہے۔

قرآن کی رو سے قوانین و ضوابط کا خالق اللہ تعالیٰ ہے نہ کہ خود انسان

کہا جاتا ہے، قانون ضابطہ بھی انسان کی اپنی پیدا کردہ چیز ہے۔ قرآن کہتا ہے، نہیں۔ پہلا قتل کیوں ہوا تھا؟ کس نے کیا تھا؟ قتل کون ہوا تھا؟ قانون کا جھگڑا تھا۔ روایات کے مطابق جو رشتہ اس کے لیے جائز نہیں تھا اس کا تقاضا کر رہا تھا؟ تو جائز ناجائز ہی قانون ہوتا ہے۔ پورا مکالمہ قرآن نے ذکر کیا ہے۔ ایک نے دھمکی دی، کہا، میں تجھے مار دوں گا۔ ہابیل نے کہا کہ میں ہاتھ نہیں اٹھاتا، آپ کی مرضی ہے (دیکھیے سورۃ المائدۃ 5، آیت: 27 تا 31)۔ تو قتل کا سبب ضابطہ اور قانون تھا۔ (جائز اور ناجائز) ضابطے اور قانون کی خلاف ورزی جھگڑے کا باعث بنی تھی۔

میں نے یہ چند باتیں اس لیے عرض کیں کہ قرآن پاک سماج اور معاشرے کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے؟ سماج کا آغاز کہاں سے اور کن خصوصیات کے ساتھ ہوا تھا۔ قرآن مجید ان کو بیان بھی کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ قدم قدم پر ہم ان کی کس طرح رہنمائی کرتے رہے ہیں۔ ایک ایک کر کے پیغمبر بھیجتے رہے جب تک سوسائٹی کا نظام انتہا اور کمال کو نہیں پہنچ گیا۔ جگہ جگہ

پیغمبرؑ بھیجے جو تمھاری رہنمائی کرتے رہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام نے عقیدے اور عبادت کے ساتھ ساتھ سماج کی بات بھی کی

پہلے فرد (Person) ہے، پھر خاندان (Family) پھر سوسائٹی (Society) پھر ریاست (State) ہے۔ ان چاروں مراحل میں قرآن پاک ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام نے ان چاروں دائروں میں رہنمائی کی ہے۔ یہ بات جو لوگوں کے ذہنوں میں ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام اس لیے آئے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ہو، شرک نہ ہو، وہ اللہ کی عبادت کا درس دینے آئے تھے، یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ لیکن انبیائے کرام علیہم السلام نے سوسائٹی میں صرف عقیدے کی بات نہیں کی بلکہ سوسائٹی کی خرابیوں کی بات بھی کی اور ان کی نشاندہی کی بلکہ ان کے خلاف جدوجہد بھی کی۔ مثلاً حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر ہے، انھوں نے کہا:

قوم اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہ (سورۃ ہود 11، آیت: 84)

(اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے۔)

آگے فرمایا:

ویا قوم اوفوا المکیال والمیزان بالقسط ولا تبخسوا الناس اشیاءھم ولا تعثوا فی الارض مفسدین (سورۃ ہود 11، آیت: 85)

(اور اے میری قوم کے لوگو! ناپ تول پورا پورا کیا کرو، اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دیا کرو۔ اور زمین میں فساد پھیلاتے مت پھرو۔)

کہ ناپ تول میں کمی نہ کرو، تم ایک نمبر مال دکھا کر دو نمبر مال مت دو، اور ان کو ان کی چیزیں کم کر کے مت دو۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو طعنے سننے پڑے۔ ایک طعنہ یہ دیا تھا، ''لانت الحلیم الرشید'' (سورۃ ہود، آیت: 87) کہ تُو تو سمجھدار آدمی ہے، یہ کیا باتیں شروع کر دیں تو نے کہ ناپ تول میں کمی نہ کرو، مارکیٹ میں کیسے دخل اندازی شروع کی؟ پھر یہ طعنہ بھی ملا:

اصلاتک تامرک ان نترک ما یعبد اٰباؤنا او ان نفعل فی اموالنا ما نشآء (سورۃ ہود 11، آیت: 87)

(کیا تمھاری نماز تمھیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہمارے باپ دادا جن کی عبادت کرتے آئے تھے، ہم انھیں بھی چھوڑ دیں۔)

کیا یہ باتیں تمہاری نمازیں تمھیں سکھاتی ہیں کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو، یہ بیچو یہ حلال ہے، یہ نہ بیچو یہ حرام ہے؟ تو حضرت شعیب علیہ السلام نے صرف عقیدہ اور عبادت کی بات نہیں کی بلکہ معاشرے کی خرابی اور حلال و حرام کی بات بھی کی۔

آپ نے قوم کے معاشی و تجارتی نظام کو موضوع بنایا ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو کہا کہ تم مرد کے مرد کے ساتھ جنسی فعل کرتے ہو اور یہ بہت غلط حرکت ہے، تم اللہ کے عذاب کو دعوت دیتے ہو، باز آجاؤ۔ حضرت لوط علیہ السلام کی دعوت کا میدان خاندانی نظام، عفت اور پاک دامنی تھی۔ جس سے انحراف وانکار پر اللہ تعالیٰ نے پوری قوم کو پتھر مار کر زمین میں دھنسا دیا تھا۔

جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو آزادی کا پرچم لے کر کھڑے ہو گئے تھے۔

فارسل معنا بنی اسرائیل ولا تعذبهم (سورۃ طہ 20، آیت: 47)

(بنو اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دو اور انھیں تکلیفیں نہ پہنچاؤ۔)

تو یہ انبیاء کرام علیہم السلام ہی تھے، ان میں سے کوئی ہم جنس پرستی کی مذمت کی بات کر رہا ہے، تو کوئی ناپ تول میں کمی اور حلال و حرام پر بات کر رہا ہے، اور کوئی قوم کی آزادی کی بات کر رہا ہے۔ یہ معاشرتی مسائل تھے انبیاء کرام علیہم السلام نے جن کی نشاندہی فرمائی۔

اب دیکھیں وقت کے ساتھ ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرے میں کیا اصلاحات فرمائیں۔ ایک جملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عرض کرنا چاہتا ہوں، آپؐ نے جب صفا پہاڑی پر کھڑے ہو کر پہلی دعوت دی تھی تو اس کے بائیس سال بعد حجۃ الوداع میں منیٰ میں کھڑے ہو کر بھی ایک بات فرمائی:

كل امر الجاهلية موضوع تحت قدمی (صحیح مسلم، باب حجۃ النبی ﷺ، حدیث نمبر 1218)

(آج جاہلیت کی ساری قدریں میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عرصہ میں کون سی قدریں پاؤں تلے روندی تھیں۔ شرک اور کفر تو تھا ہی، شراب تھی، سود، عریانی، فحاشی، ہم جنس پرستی، بچیوں کو زندہ دفن کرنا، قبائلی عصبیت، ناچ گانا، یہ ساری باتیں تھیں یا نہیں؟ تو میں نے آج یہ بات تمہیدی طور پر عرض کی کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پاک صرف عقیدہ اور عبادت کی بات نہیں کرتے بلکہ سماج اور معاشرت کی بات بھی کرتے ہیں، اسلام کی بات کرتے ہیں، اور اسلام کا جامع پیغام بھی یہی ہے کہ آنے والا دور سسٹم کے ٹکراؤ اور اسلام کی بالادستی کا دور ہوگا۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

(جاری)

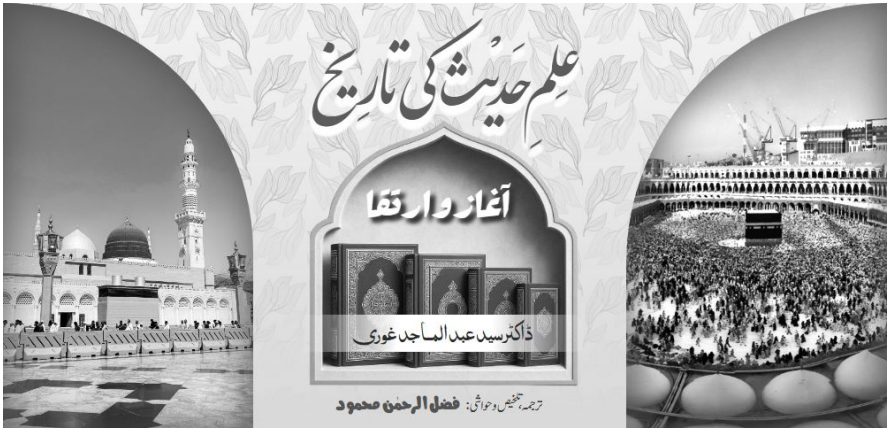

طالب شریعت کے لیے علمِ حدیث کی اہمیت ڈھکی چھپی نہیں؛ کیوں کہ اسی علم کو وسیلہ بنا کر رسول اکرم ﷺ کی احادیث کو دسیسہ کاری، ردوبدل، دھوکے اور کذب بیانی سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ علمِ حدیث کی پانچ شاخیں ہیں:

۱. اسناد
۲. تاریخ رواۃ وعلم رجال
۳. جرح وتعدیل کا بیان اور رواۃ کے حالات کی جانچ پڑتال
۴. متن حدیث کا جائزہ اور اس سے متعلق علوم
۵. علم جرح وتعدیل[1]۔

امام عراقی رحمہ اللہ[2] اپنی ”شرح الفیۃ“ میں اس علم کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”علمِ حدیث کی نہایت اہمیت ہے، فائدہ بہت زیادہ ہے، اسی پر اکثر احکام کا مدار ہے، اسی سے حلال و حرام کی پہچان حاصل ہوتی ہے، علماے حدیث کی خاص اصطلاحات ہیں جنھیں سمجھنا طالب علم کے لیے ضروری ہے“[3]۔

مولانا سید سلمان ندوی[4] نے علمِ حدیث کی قدر ومنزلت کے حوالے سے عمدہ کلام کیا ہے۔ روایت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:

”روایت ضروری چیز ہے۔ کسی بھی علم اور دنیوی معاملات میں نقل و روایت کے بغیر چارہ نہیں۔ انسان ہر واقعے میں حاضر نہیں رہ سکتا؛ اس لیے غیر حاضر لوگوں تک زبانی یا تحریری روایت سے ہی واقعات کو پہنچایا جاے گا۔ روایت ہی کے ذریعے سے پچھلی نسلوں کے واقعات بعد میں آنے والی نسلوں تک پہنچاے جا سکتے ہیں۔ گذشتہ اور موجودہ قوموں کی تاریخیں، مذاہب وادیان، حکما وفلاسفہ کے نظریات اور سائنس دانوں کی ایجادات وتجربات ہم تک نقل وروایت سے ہی پہنچی ہیں۔ احادیث چوں کہ خبریں ہیں؛ اس لیے ان کی جانچ پڑتال اور صحیح وسقیم کو الگ کرنے کے لیے ایسے اصول برتنا ضروری ہیں، جو ہم تمام روایات اور خبروں میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ اور ان جیسے دوسرے قواعد محدثین نے احادیث کی جانچ پڑتال کے لیے استعمال کیے ہیں۔ محدثین انھیں ”اصول حدیث“ کا نام دیتے ہیں اور انھی کو برت کر صحیح اور ضعیف احادیث کو علاحدہ علاحدہ کیا ہے“[5]۔

علمِ حدیث کن ادوار سے گزرا اور کیسے تکمیلی مرحلے میں داخل ہوا، یہ سب ذیل کی سطور میں بیان کیا گیا ہے۔

مترجم

علمِ حدیث کی تاریخ: آغاز وارتقا

علمِ حدیث کی تاریخ کو تین مراحل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

- مرحلۂ اول: امام ابن صلاح سے قبل لکھی گئی کتب علمِ حدیث
- مرحلۂ دوم: ابن صلاح کے مقدمے اور اس کے بعد لکھی گئی علمِ حدیث کی کتب
- مرحلۂ سوم: کتب علمِ حدیث کا یہ تیسرا دور ہے۔ اس دور میں تالیف شدہ کتابوں میں جمود اور ٹھہراؤ نظر آتا ہے۔

مرحلۂ اول:

امام ابن صلاح سے قبل لکھی گئی کتب علمِ حدیث

چوتھی صدی ہجری میں ”علم مصطلح الحدیث“ یا ”علم اصول حدیث“ یا ”مصطلح الحدیث“ ایک مستقل علم اختیار کر گیا۔ اسی زمانے میں علمِ حدیث میں

کتابیں تصنیف کی گئیں اور مستقل رسالے لکھے گئے۔ جس سے اس علم کے مرتب اصول اور معروف قواعد سامنے آئے۔

اصول حدیث کے بعض مسائل کی تسہیل اور بنیادی قواعد کی تدوین اسی وقت سے شروع ہو گئی تھی، جب تاریخ رجال و کتب حدیث لکھنے کا آغاز ہوا۔ اس سے قبل یہ علم سینوں میں محفوظ تھا اور زبانی بیان کیا جاتا تھا۔ جب کتب حدیث و رجال لکھی جانے لگیں تو ان میں ادھر ادھر سے اصول حدیث کے کچھ قواعد کا اضافہ بھی ہونے لگا؛ البتہ جامع اور خصوصی کتاب چوتھی صدی ہجری میں ہی سامنے آئی۔ اس سے قبل اگر کچھ لکھا گیا ہے تو وہ مستقل رسائل، بکھرے جملے یا علم حدیث کے بعض مسائل سے متعلق رسائل تھے۔

دوسری صدی ہجری کے آخری حصے میں علوم الحدیث کے بعض مباحث سے متعلق تالیف کا آغاز ہوا۔ موضوعات کی رعایت رکھتے ہوئے مستقل ابواب کی شکل میں کتابیں لکھیں گئیں۔ ایک موضوع سے متعلق معلومات اکٹھی کر کے انھیں ایک جزو یا چند اجزا میں مکمل کیا جاتا، جس سے آج کے دور کے اعتبار سے مختصر کتاب وجود میں آجاتی۔ امام علی بن مدینی بصری (رحمہ اللہ)[6] نے سب سے پہلے اس میدان میں قلم اٹھایا اور علوم الحدیث کی چند انواع سے متعلق کتابیں تحریر فرمائیں۔ ہر نوع پر علاحدہ کتاب لکھی۔ ان کی "علل" کے موضوع پر بھی ایک کتاب ہے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے سب سے پہلے اپنی کتاب "الرسالہ" میں علم حدیث و مصطلح کے بعض اہم مباحث و مسائل پر لکھا، مثال کے طور پر: قابل استدلال حدیث کی شرائط، ضبط راوی کی شرط، روایت بالمعنیٰ، حدیث مدلس کی قبولیت۔ اسی طرح حدیث مرسل کے بارے میں ان کا موقف کافی مشہور ہے۔ مقدمۂ ابن صلاح پر حافظ عراقی کے حاشیے میں لکھا ہے کہ انھوں نے حدیث حسن کو اپنی کتابوں میں برتا ہے[7]۔ ان کے بعد امام حمیدی نے بھی اصول روایت سے متعلق اپنی کتاب میں ان مباحث کا ذکر کیا ہے[8]۔

علوم الحدیث کا تکمیلی مرحلہ

تیسری صدی اور پانچویں صدی کے درمیانی زمانے میں علم حدیث کی تکمیل ہوئی۔ تیسری صدی ہجری میں یحییٰ بن معین[9]، احمد بن حنبل، امام بخاری، ابو جعفر مخزمی[10] و دیگر حضرات نے بہ کثرت یا کمال تحقیق و تفتیش سے کام لیتے ہوئے روات کو جرح و تعدیل کی میزان پر پرکھا۔ اسی طرح حافظ محمد بن عبد اللہ بن نمیر کوفی[11] اور یعقوب بن شیبہ سدوسی بصری[12] جیسے علماے حدیث نے احادیث کی جمع و تدوین کے دوران میں متن اور سند پر کلام کیا۔ تیسری صدی کے دوران میں ہی کتب رجال، کتب حدیث اور ایک موضوع کو سامنے رکھ کر لکھی گئی مستقل میں کتابوں میں ذکر کیے گئے مسائل کے ذریعے اس علم کی شکل و صورت واضح طور پر سامنے آگئی تھی۔ اس کی مثال امام علی بن مدینی کی کتابیں ہیں۔ علم حدیث کے موضوعات پر لکھنے والے اس صدی میں بڑھ گئے۔ مثال کے طور پر:

- امام ابو محمد عبد اللہ بن عبد الرحمن الدارمی[13] نے اپنی سنن کے عمدہ مقدمے میں علم حدیث پر کلام کیا ہے۔
- امام ابو عبد اللہ بخاری کی "الجامع الصحیح" اور دیگر کتب "التاریخ" و "الضعفاء" میں مسائل حدیث پر بہت جملے ملتے ہیں۔
- امام مسلم بن حجاج کی کتاب "الجامع الصحیح" کے آغاز میں ایک عمدہ مقدمہ ہے، جس میں انھوں نے علم مصطلح کے اچھے بھلے مسائل پر کلام کیا ہے۔ مصطلح کے قواعد پر تمہیدی کلام کے حوالے سے مقدمۂ صحیح مسلم اور انھی کی کتاب "التمییز" کا شمار علم حدیث کی اولین کاوشوں میں ہوتا ہے[14]۔
- امام ترمذی نے اپنی کتاب "الجامع" کے آخر میں "العلل الصغیر" کے نام سے نہایت بہترین جزو شامل کیا ہے۔ اس میں علم حدیث کے بہت سے اہم مباحث آگئے ہیں۔
- امام ابوداؤد سجستانی نے اہل مکہ کے نام اپنی "سنن" کی خصوصیات کے بارے میں ایک "رسالہ" لکھا۔ اس میں بھی علم حدیث کے مسائل کی اچھی مقدار آگئی ہے۔ اسی طرح اپنی کتاب "العلل و معرفۃ الرجال" میں علم مصطلح کے بارے میں بہت معلومات جمع کی ہیں۔
- امام ابو جعفر طحاوی رحمہ اللہ[15] نے "التسویۃ: بین حدثنا و اخبرنا" کے نام سے ایک مختصر اور عمدہ رسالہ لکھا ہے، جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ، خواہ آپ شیخ کی زبانی احادیث سنیں یا ان کے سامنے پڑھیں، دونوں حالتوں میں "حدثنا" اور "اخبرنا" کے الفاظ بغیر کسی فرق کے استعمال کر سکتے ہیں۔
- امام ابن عبد البر اندلسی[16] نے بھی "التمہید لما فی الموطا من المعانی والاسانید" کے وسیع و کامل مقدمے میں علم حدیث پر کلام کیا ہے۔
- امام ابن اثیر[17] نے بھی اپنی کتاب "جامع الاصول فی احادیث الرسول" کے مقدمے میں علم مصطلح پر قلم اٹھایا ہے۔ اصول حدیث اور اس کے احکام و متعلقات پر یہ مباحث انھوں نے تیسرے باب میں لکھے ہیں۔

علوم الحدیث کے مباحث کی جمع و تدوین

چوتھی صدی ہجری میں چند علماے حدیث نے علم حدیث کے بکھرے قواعد و مباحث کو ایک جامع کتاب میں جمع کرنا شروع کیا۔ چناں چہ پہلے سے لکھی گئی کتابوں سے استفادہ کر کے انھوں نے ایک فن کی متفرق معلومات کو یک جا کر دیا، جو باتیں پہلوں سے رہ گئی تھیں ان کا اضافہ کیا، پرانے علما کی

طرح مکمل سند کے ساتھ معلومات ذکر کرکے ان پر تبصرے (وحواشی) تحریر کیے اور مسائل کا استنباط کیا، جس کی وجہ سے علوم حدیث میں ایسی کتابیں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئیں، جن سے استفادہ کیے بغیر چارہ نہیں۔ اہم کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

المحدث الفاصل بین الراوی والواعی: یہ قاضی ابو محمد الحسن بن خلاد فارسی رامہرمزی[18] کی کتاب ہے۔ تدوین علم حدیث کی فہرست میں یہ پہلی جامع و مستقل کتاب شمار ہوتی ہے۔

معرفۃ علوم الحدیث و کمیۃ اجناسہ: یہ امام ابو عبد اللہ الحاکم نیشاپوری[19] کی کتاب ہے۔ امام ابن خلدون فرماتے ہیں: علوم الحدیث کے جلیل القدر علما وائمہ میں ابو عبد اللہ الحاکم کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی تالیفات مشہور ہیں۔ انھوں نے ہی علم حدیث کو حسن ترتیب دی اور اس کی بھلائیوں کو اجاگر کیا[20]۔

الکفایۃ فی معرفۃ اصول الروایۃ: یہ محدث ابوبکر خطیب بغدادی[21] کی کتاب ہے۔

الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع: یہ کتاب بھی خطیب بغدادی نے لکھی ہے۔ طلب حدیث اور راوی کے اخلاق وآداب کے موضوع پر اس کتاب کا شمار اولین کاوشوں میں ہوتا ہے۔

الالماع فی اصول الروایۃ والسماع: یہ قاضی وحافظ عیاض بن موسیٰ یحصبی[22] کی تالیف ہے۔ اس کے عنوان سے ہی معلوم ہو رہا ہے کہ اس کتاب میں حصول حدیث کے مختلف طریقوں اور روایت حدیث کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ یہ بہت مفید کتاب ہے۔

مالایسع المحدث جہلہ: یہ ابوحفص عمر بن عبد المجید میانجی[23] کا تقریباً سات صفحات پر مشتمل مختصر رسالہ ہے[24]۔

مرحلۂ دوم:

ابن صلاح کا مقدمہ اور اس کے بعد لکھی گئی کتب علم حدیث

یہ مرحلہ ساتویں صدی سے شروع ہو کر دسویں صدی تک جاتا ہے۔ اس مرحلے میں علم حدیث کی تدوین بام عروج تک پہنچ گئی۔ ایسی تصانیف و تالیفات سامنے آئیں، جن میں علم حدیث کی انواع کا مکمل احاطہ کیا گیا، عبارتوں کی اصلاح کی گئی اور مسائل باریکی سے لکھے گئے۔ ان تصانیف و تالیفات کو لکھنے والے گذشتہ بڑے ائمہ کی طرح علمی رسوخ کے حامل تھے، انھوں نے احادیث مکمل یاد کیں، فنون حدیث اور اسانید و متون میں علم و درایت کے لحاظ سے مہارت پیدا کی۔

علم حدیث کی تدوین میں اس گراں قدر تبدیلی کے پیش رو "امام ابو عمرو عثمان بن عبد الرحمن شہرزوری" ہیں۔ آپ ابن صلاح کے نام سے مشہور ہیں[25]۔ "معرفۃ علوم انواع علوم الحدیث" کے نام سے آپ نے کتاب لکھی، جو مقدمۂ ابن صلاح کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ یہ کتاب متاخرین علما کا سہارا ہے۔ ابن صلاح نے یہ کتاب وقفے وقفے سے املا کرائی، اسی وجہ سے اس کتاب میں مناسب علمی ترتیب نظر نہیں آتی۔ پینسٹھ انواع پر مشتمل اس کتاب میں آپ نے خطیب بغدادی و دیگر علما کی اصول فقہ و اصول حدیث پر لکھی گئی کتابوں سے متفرق مواد اکٹھا کر دیا ہے۔ مواد کی کثرت اور حسن تحریر کی بنا پر یہ کتاب مشہور ہو گئی۔ علما اس کی تدریس، تشریح، تلخیص، تائید و اختلاف اور اس کے مشمولات کو نظمانے میں مصروف ہو گئے۔ یہاں تک کہ اصول کی ہر بنیادی کتاب، جیسے سخاوی کی فتح المغیث اور سیوطی کی تدریب الراوی وغیرہ، مقدمۂ ابن صلاح کی جراگاہ سے مستفید اور اسی کی خوشہ چین ہے۔

امام ابن صلاح نے بڑھتی عمر میں یہ کتاب لکھی۔ اس وقت آپ کا علم کامل اور ٹھوس ہو چکا تھا۔ آپ نے اپنی تصنیف میں ٹھہراؤ اور گہرے تدبر سے کام لیا۔ بہت سی مجالس میں اسے املا کرا کے مکمل کیا۔ ان مجالس کے درمیان وقفے بھی آتے رہے۔ کتاب کے شروع میں ایک مقدمہ ہے، جس میں اس فن کی خصوصیت اور شدید ضرورت کا بیان ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"تحقیق کار کو جب اس فن کی مشکلات کا گرہ کشا نہ ملا اور اس علم کے متعلق سوال کرنے والے کو فن کا شناسا نہ مل سکا تو خداوند کریم نے مجھ پر احسان کرتے ہوئے "معرفۃ انواع علم الحدیث" کتاب لکھنے کی توفیق بخشی۔ اسی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ اس کتاب نے فن حدیث کے پوشیدہ راز اور ادبی مشکلات آشکارا کر دیے ہیں"۔

اس کے بعد ابن صلاح نے علوم حدیث کی پینسٹھ انواع ذکر کر کے مضامین کتاب کی ایک فہرست مہیا کی ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انواع کسی خاص نظم و ترتیب کے بغیر ذکر کر دی گئی ہیں۔ اسناد سے متعلق ایک نوع ذکر کرنے کے بعد متن یا اسناد و متن دونوں سے متعلق نوع کا ذکر کر دیتے ہیں۔

مصطلح کے میدان میں اپنی بہت زیادہ خوبیوں کے باعث یہ کتاب ہر صاحب حدیث، محدث اور عالم کے لیے رہ نما اور چشمۂ شیریں کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اس کے ظہور پذیر ہونے کے بعد علما نے اس پر شرحیں لکھیں، اس کا اختصار کیا، حواشی سے مزین کیا اور اس کے مضامین کو نظمایا۔ جس کی تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

مقدمۂ ابن صلاح کی شرحیں

الجواہر الصحاح فی شرح علوم الحدیث لابن الصلاح: یہ عزالدین ابو عمرو عبد العزیز بن محمد بن جماعہ دمشقی[26] کی کتاب ہے۔

الشذا الفیاح من علوم الحدیث: یہ برہان الدین ابو اسحاق ابراہیم بن موسیٰ بن ایوب ابناسی قاہری[27] کی کتاب ہے۔

محاسن الاصطلاح وتضمین کتاب ابن الصلاح: یہ شیخ الاسلام سراج الدین ابوحفص عمر بن رسلان بن نصیر مصری بلقینی[28] کی کتاب ہے۔

مقدمۂ ابن صلاح پر ''النکت'' کے عنوان سے لکھی گئی کتب

النکت علی کتاب ابن الصلاح: یہ امام بدر الدین زرکشی ابو عبد اللہ محمد بن بہادر مصری[29] کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں جامعیت ہے۔ یہ قسم ہا قسم کے مضامین کا گل دستہ ہے۔ اس میں حدیث، فقہ، اصول، لغت و نحو کے مباحث کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ امام زرکشی جری ناقد تھے۔ اسی لیے انھوں نے ابن صلاح پر استدراکات لکھے اور بعض دیگر اقوال کو بھی ہدف تنقید بنایا۔

التقیید والایضاح لما اطلق واغلق من کتاب ابن الصلاح: یہ حافظ زین الدین ابوالفضل عبد الرحیم بن حسین عراقی کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں مولف نے ابن صلاح کی تمام عبارتیں ذکر نہیں کیں؛ بلکہ صرف انھی عبارتوں کا ذکر کیا جن کے بارے میں مولف کا گمان تھا کہ صرف ان کی تشریح اور انھی پر نکتہ آفرینی کی ضرورت ہے۔

اصلاح ابن الصلاح: یہ حافظ علاء الدین ابو عبد اللہ مغلطائی بن قلیج بکری مصری کی کتاب ہے۔

النکت علی کتاب ابن الصلاح: یہ حافظ شہاب الدین ابوالفضل احمد بن علی بن حجر عسقلانی مصری[30] کی کتاب ہے۔

مقدمۂ ابن صلاح کے مختصرات

ارشاد طلاب الحقائق الی معرفۃ سنن خیر الخلائق: یہ ابوزکریا یحیی بن شرف الدین النووی[31] کی کتاب ہے۔ یہ کتاب لکھنے کے بعد امام نووی نے ''تقریب'' کے نام سے اس کا خلاصہ لکھا۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے اسی ''تقریب'' کی تدریب الراوی میں تشریح کی ہے۔

رسوم التحدیث فی علوم الحدیث: یہ امام ابراہیم بن عمر بن ابراہیم جعبری[32] کی عمدہ ومختصر کتاب ہے۔ طویل شرح وتوضیح میں جائے بغیر ایک عالم اس کتاب کے ذریعے علم حدیث کے مباحث یاد رکھ سکتا ہے۔

المنہل الروی فی علوم الحدیث: یہ قاضی بدر الدین ابو عبد اللہ محمد بن ابراہیم بن سعد اللہ بن جماعہ حموی[33] کی تصنیف ہے۔ یہ مقدمۂ ابن صلاح کا عمدہ خلاصہ ہے۔

الخلاصۃ فی معرفۃ الحدیث: یہ امام شرف الدین حسین بن محمد طیبی مصری شافعی[34] کی تالیف ہے۔ علم حدیث میں یہ مختصر رسالہ ہے۔ اس رسالہ میں مولف نے حدیث کی اہم مصطلحات کا تعارف کرایا ہے۔

المنتخب فی علوم الحدیث: یہ قاضی ابوالحسن علی بن عثمان ماردینی مصری حنفی کی تالیف ہے۔ آپ ''ابن ترکمانی''[35] کے نام سے مشہور ہیں۔ ابن فہد اپنی کتاب ''لحظ الالحاظ''[36] میں فرماتے ہیں: ''یہ ابن صلاح کی کتاب کا بہترین و کامل اختصار ہے''۔

اختصار علوم الحدیث: یہ حافظ عماد الدین ابن کثیر دمشقی[37] کی کتاب ہے۔ علامہ احمد شاکر نے ''الباعث الحثیث'' کے نام سے اس کی شرح اور شیخ ناصر الدین البانی نے اس پر ''تعلیقات'' لکھیں۔

المقنع فی علوم الحدیث: یہ حافظ سراج الدین ابوحفص عمر بن علی بن احمد انصاری مصری کی کتاب ہے۔ آپ ''ابن الملقن''[38] کے نام سے مشہور ہیں۔ اس کا شمار مقدمۂ ابن صلاح کے بہترین خلاصوں میں ہوتا ہے۔ مولف نے اس کتاب میں مقدمۂ ابن صلاح میں کی گئی انواع کی تقسیم ہی کی پیروی کی ہے اور ایک ماہر عالم کی مانند علم اصطلاح کا احاطہ کیا ہے۔

مقدمۂ ابن صلاح کے منظومات

مقدمۂ ابن صلاح پر لکھے گئے اہم منظومات یہ ہیں:

التبصرۃ والتذکرۃ: یہ امام زین الدین ابوالفضل عبد الرحیم بن حسین عراقی کا منظومہ ہے۔ اس کی شرح انھی کے شاگرد حافظ سخاوی نے ''فتح المغیث'' کے نام سے لکھی۔

الفیۃ السیوطی فی علم الحدیث: یہ جلال الدین عبد الرحمن بن ابی بکر سیوطی کا منظومہ ہے۔ آپ نے اس منظومے کی خود ہی ''البحر الذی زخرفی شرح الفیۃ الاثر'' کے نام سے شرح لکھی؛ لیکن اسے مکمل نہ کر سکے۔ ڈاکٹر انیس طاہر اندونیشی نے اس کتاب کو ایڈٹ کر کے ''مکتبۃ الغرباء الاثریہ'' سے چھپوایا۔

محاسن الاصطلاح وتضمین کتاب ابن الصلاح: یہ امام بلقینی کی کتاب ہے۔ اسے محدث زین الدین ابوالعز طاہر بن حسن حلبی حنفی نے نظمایا ہے۔ آپ بلقینی کے شاگرد اور ''ابن حبیب''[39] کے نام سے مشہور ہیں۔ حافظ ابن حجر اپنی کتاب ''انباء الغمر'' میں فرماتے ہیں: ''یہ بلقینی کی کتاب محاسن الاصطلاح کا سب سے اچھا منظومہ ہے''[40]۔

اس طرح بعد میں آنے والے ہر عالم نے ابن صلاح کی کتاب پر بھروسا کیا۔ کسی نے اس کا خلاصہ لکھا، کسی نے نظمایا اور کچھ حضرات نے اس کی شرحیں لکھیں اور حواشی سے مزین کیا۔

امام ابن صلاح کے بعد علم مصطلح میں لکھی گئی مستقل کتب

ایک زمانہ ایسا آیا جس میں علما نے مستقل کتب کی تالیف کا آغاز کیا۔ یہ علما علمی قواعد کی وضاحت میں ابن صلاح کے محض پیرو نہیں تھے؛ بلکہ انھوں نے اپنی ذاتی آرا پیش کیں، اکثر مقامات پر ان کے مقرر کردہ قواعد مباحث کی کسوٹی پر پرکھے یا ان سے مخالفت کی۔ یہاں میں علم مصطلح الحدیث کے موضوع پر لکھی گئی ان کی چند تالیفات کا ذکر کرتا ہوں۔ ان تالیفات میں

تقلید سے زیادہ اختراع واجتہاد کی شان نظر آتی ہے:

الاقتراح فی بیان الاصطلاح: یہ امام ابن دقیق العید[41] کی تصنیف ہے۔

الموقظۃ فی علم مصطلح الحدیث: یہ امام محمد بن احمد ذہبی[42] کی تصنیف ہے۔ مختصر ہونے کے باوجود اس میں روشن فوائد اور یکتا جواہر پارے موجود ہیں۔ ''الموقظۃ'' امام ابن دقیق العید کی کتاب ''الاقتراح'' کا خلاصہ ہے۔

مختصر فی علوم الحدیث: یہ سید شریف جرجانی[43] کی کتاب ہے۔

نخبۃ الفکر و شرحہ نزہۃ النظر: یہ امام ابن حجر عسقلانی کی تالیف ہے۔

فتح المغیث بشرح الفیۃ الحدیث: یہ امام محمد بن عبد الرحمن سخاوی[44] کی تصنیف ہے۔ کشف الظنون کے مولف فرماتے ہیں: ''الفیۃ العراقی کی شروحات میں شاید یہ سب سے اچھی شرح ہے''[45]۔

تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی: یہ امام حافظ جلال الدین عبد الرحمن بن ابوبکر سیوطی[46] کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں صرف معلومات جمع کر دی گئی ہیں؛ لیکن علم حدیث کے مسائل پر کچھ اچھے مباحث بھی موجود ہیں۔

مرحلۂ سوم: علمی جمود اور ٹھہراؤ کا دور

علم حدیث کا یہ تیسرا دور دسویں صدی سے لے کر پندرھویں صدی ہجری کے آغاز تک جاتا ہے۔ اس مرحلے میں علمی اجتہاد کا عنصر غائب ہو گیا، تصنیف میں جدت باقی نہ رہی، علوم حدیث کے میدان میں شعری ونثری مجموعے کثرت سے سامنے آنے لگے، لکھاری، مولفین کی عبارتوں کو سامنے رکھ کر لفظی موشگافیوں میں مصروف ہو گئے، مضمون کی گہرائی میں جانا چھوڑ دیا اور تحقیق یا اجتہاد دروازہ بند ہو گیا۔

اس زمانے میں سامنے آنے والی چند تالیفات کے نام درج ذیل ہیں:

منظومہ بیقونیہ: یہ عمر بن محمد بن فتوح بیقونی[47] کی تالیف ہے۔

توضیح الافکار فی شرح تنقیح الانظار: یہ امام محمد بن اسماعیل امیر صنعانی[48] کی تصنیف ہے۔

شرح شرح نخبۃ الفکر فی مصطلحات اہل الاثر: یہ محدث علامہ علی بن سلطان محمد القاری[49] کی تالیف ہے۔ نخبۃ الفکر کی یہ سب سے اچھی اور عمدہ شرح ہے۔

مصطلح کے موضوع پر دورِ جدید میں لکھی جانے والی کتب

دور جدید میں علم حدیث کے میدان میں کئی کاوشیں منصۂ علم پر جلوہ گر ہوئی ہیں۔ ان کے لکھنے والے جلیل القدر علما تھے۔ ان کاوشوں میں دور جدید کی زبان، منہج واسلوب کو اختیار کر کے پرانے علما کے بیان کیے ہوئے مباحث کو آسان انداز میں ڈھالا گیا ہے۔ تحریک نو کے اس مرحلے میں اصول حدیث ومصطلح کے موضوع پر لکھی گئی چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں:

قواعد التحدیث من فنون مصطلح الحدیث: یہ شیخ جمال الدین قاسمی[50] کی کتاب ہے۔

توجیہ النظر الی اصول اہل الاثر: یہ علامہ طاہر جزائری[51] کی تالیف ہے۔

الوسیط فی علوم الحدیث: یہ علامہ محمد بن محمد ابوشہبہ[52] کی کتاب ہے۔ دور جدید میں لکھی جانے کتب حدیث میں یہ سب سے عمدہ کتاب ہے۔

تیسیر مصطلح الحدیث: یہ استاد محمود طحان[53] کی تصنیف ہے۔ علوم الحدیث کی یہ سب سے آسان اور بہترین کتاب ہے۔ اس میں فاضل مولف نے مبتدی طالب علموں کی رعایت کرتے ہوئے مباحث ذکر کیے ہیں۔

تحریر علوم الحدیث: یہ شیخ عبد اللہ بن یوسف جدیع[54] کی کتاب ہے۔ اس میں مولف نے متقدمین اور سلف صالحین کے انداز کو اپنایا ہے۔

منہج النقد فی علوم الحدیث: یہ شیخ نور الدین عتر[55] کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں دیگر کتابوں کی بہ نسبت مضامین کی بڑے اچھے طریقے سے تفصیل بیان کی گئی ہے اور مباحث کی تقسیم عمدہ ہے۔

معجم المصطلحات الحدیثیہ: یہ شیخ نور الدین عتر کی کتاب ہے۔ مصطلح کے موضوع پر یہ پہلی قاموس ہے، جو بعد میں اسی طرز پر لکھی جانے والی تواميس کے لیے چراغ کی حیثیت رکھتی ہے۔

حواشی

1. لمحات من تاریخ السنۃ وعلوم الحدیث، عبد الفتاح ابوغدۃ، ن: مکتب المطبوعات الإسلامیۃ، حلب، ط الاولی: 1414ھ: 1984م (ص: 101)

2۔ ان کا نام: زین الدین عبد الرحیم بن حسین بن عبد الرحمن عراقی ہے، اپنے زمانے کے حافظ حدیث تھے۔ قاہرہ میں جمادی الاولی کے مہینے میں 725ہجری میں ولادت ہوئی۔ فن حدیث حاصل کر کے اس میں مہارت پیدا کی اور ہم عصروں سے آگے بڑھ گئے۔ آپ کے اساتذہ بھی آپ کی فنی مہارت کی بڑھ چڑھ کر تعریف کرتے۔ آپ کی کئی تالیفات ہیں: الفیہ اور اس کی شرح، نظم الاقتراح، تخریج احادیث الاحیا، تکملہ شرح الترمذی لابن سید الناس۔ آپ نیک اور متواضع تھے۔ ہاتھ تنگ تھا۔ 806ہجری میں وفات ہوئی۔ (حسن المحاضرۃ فی تاریخ مصر والقاہرہ، سیوطی: 1/360)

3۔ شرح التبصرۃ والتذکرۃ = اَلفیۃ العراقي، اَبو الفضل زین الدین عبد الرحیم بن الحسین بن عبد الرحمن بن اَبي بکر بن إبراهیم العراقي، تحقیق: عبد اللطیف ھمیم۔ ماھر یاسین الفحل، ن: دار الکتب العلمیۃ بیروت، ط الاولی: 1423ھ: 2002م، (1/97)

4۔ آپ کا نام سلمان بن طاہر الحسینی ندوی ہے۔ ایک داعی اور مربی کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ لکھنؤ میں ۱۹۵۴ء میں آپ کی

پیدائش ہوئی۔ ندوۃ العلما، لکھنو، انڈیا سے حدیث ڈیپارٹمنٹ سے فضیلت کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد جامعہ امام محمد بن سعود یونی ورسٹی (ریاض) میں کلیہ اصول الدین میں داخلہ لیا اور ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ عربی و اردو میں آپ کی کئی کتابیں ہیں، مثال کے طور پر: جمع ألفاظ الجرح والتعدیل ودراستها من کتاب "تهذیب التهذیب" للحافظ ابن حجر، التعریف الوجیز بکتب الحدیث، لمحة عن علم الجرح والتعدیل، الأمانة في ضوء القرآن (دیکھیے: المدخل إلى دراسة جامع الترمذي مع تقدیم وتعلیق الشیخ سلمان الحسیني الندوي: صـ22)

5۔ تحقیق معنی السنۃ ومکانتھا، مقالہ: سید سلمان ندوی، مجلہ (المسلمون)، جلد:۶، ص:۵۶۵، شمارہ:۶ (ص:۴۹)

6۔ ان کا نام ابوالحسن علی بن عبداللہ بن جعفر ہے۔ اپنے زمانے کے حافظ حدیث تھے۔ اعیان حدیث اور ثقہ راویوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ علل الحدیث میں اعلیٰ اور آخری درجے پر فائز تھے۔ امام بخاری کے استاد اور یحییٰ بن سعید القطان کے شاگرد ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی دو سو (۲۰۰) تصانیف ہیں۔ سامرا میں ذی القعدہ ۲۳۴ ہجری میں ان کی وفات ہوئی۔ (دیکھیے: میزان الاعتدال، ذہبی: ۳/۱۳۸)

7۔ ص:۸و۳۸

8۔ المنهج المقترح لفهم المصطلح، الشریف حاتم العوني بن عارف العوني، ن: دار الهجرة للنشر والتوزیع، الطبعة الأولى: 1416ھ: 1996م، (صـ 183)

9۔ ان کا نام یحییٰ بن معین بن عون بن زیاد ہے۔ ابوزکریا کنیت ہے۔ تاریخ رواۃ کے ماہرین اور ائمۂ حدیث میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ علم رجال میں ان کی کتاب التاریخ والرجال، معرفۃ الرجال اور الکنی والاسماء ہے۔ ان کے والد بہت سا مال چھوڑا تھا، جسے انھوں نے طلب حدیث میں خرچ کر دیا۔ بغداد میں زندگی گزاری۔ ۲۳۳ھ میں وفات ہوئی۔ (دیکھیے: الاعلام للزرکلی: ۸/۱۷۳)

10۔ ان کا نام محمد بن عبداللہ بن مبارک، ابوجعفر مخرمی ہے۔ حافظ حدیث اور ثقہ راوی ہیں۔ حلوان کے قاضی تھے۔ امام یحییٰ بن معین اور یحییٰ بن سعید القطان سے روایت کرتے ہیں۔ ۲۵۴ھ میں وفات ہوئی۔ (دیکھیے: تہذیب الکمال، مزی: ۲۵/۵۳۸)

11۔ ان کا نام محمد بن عبداللہ بن نمیر، ابوعبدالرحمن ہمدانی کوفی ہے۔ حافظ، حجت اور شیخ الاسلام کے لقب سے جانے جاتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل اور علی بن مدینی کے ہم عصر ہیں۔ امام بخاری و مسلم نے ان کی روایات اپنی "صحیحین" میں ذکر کی ہیں۔ علم، فہم، سنت و زہد سے متصف تھے۔ ۲۳۴ھ کو شعبان یا رمضان میں ان کی وفات ہوئی۔ (دیکھیے: سیر اعلام النبلاء، ذہبی: ۱۱/۴۵۷)

12۔ ان کا نام یعقوب بن شیبہ بن صلت بن عصفور ہے۔ اپنے زمانے کے حافظ و علامہ تھے۔ ابویوسف کنیت تھی۔ بغداد میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ المسند الکبیر المعلل کے نام سے کتاب لکھی۔ اس سے بہترین کوئی اور مسند نہیں لکھی گئی لیکن امام انھیں مکمل نہ کر سکے۔ بڑے علمائے حدیث میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ خطیب بغدادی و دیگر نے ان کی توثیق کی ہے۔ عراق کے قاضی رہے۔ ۲۶۲ھ میں ان کی وفات ہوئی (دیکھیے: تذکرۃ الحفاظ، ذہبی: ۲/۱۱۸)

13۔ ان کا نام عبداللہ بن عبدالرحمن بن فضل بن بہرام بن عبدالصمد ہے۔ کنیت ابومحمد الدارمی ہے۔ حدیث حاصل کرنے کے لیے بہت اسفار کیے۔ ثقاہت، سچائی، ورع و زہد کے مالک تھے۔ حدیث پاک کو نہایت مضبوطی سے حفظ و جمع کیا۔ حدیث میں "مسند" لکھی اور تفسیر میں طبع آزمائی کی۔ ۲۵۰ھ میں وفات ہوئی۔ (دیکھیے: تاریخ بغداد: ۱۱/۲۰۹)

14۔ مقالات الکوثري، محمد زاهد الکوثري، ن: المکتبة التوفیقیة، القاهرة، (صـ: 83) تاریخ طباعت واشاعت مذکور نہیں۔

15۔ ان کا نام ابوجعفر احمد بن محمد بن سلامہ بن سلمہ ازدی حنفی ہے۔ ۲۳۷ھ میں ولادت ہوئی۔ ثقہ، ثبت، فقیہ و عقل مند تھے۔ امام مزنی کے بھانجے تھے۔ اختلاف العلماء، شروط، احکام القرآن العظیم اور معانی الآثار کے نام سے کتابیں لکھیں۔ ۸۰ سال سے زیادہ کی عمر پا کر ۳۲۱ھ میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ (دیکھیے: تذکرۃ الحفاظ، ذہبی: ۳/۲۱)

16۔ ان کا نام ابوعمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر بن عاصم نمری ہے۔ فقیہ و حافظ اور بلند و بالا تصانیف کے حامل ہیں۔ علم حدیث، رجال، قراءات و نسب وغیرہ کے ماہر۔ امام مالک کی موطا پر "التمہید" اور "الاستذکار" کے نام سے کتابیں لکھیں۔ صحابہ کے حالات پر الاستیعاب نامی کتاب لکھی۔ ان کے علاوہ دیگر تصانیف بھی ہیں۔ ۴۶۳ھ میں وفات ہوئی۔ (دیکھیے: سیر اعلام النبلاء، ذہبی: ۱۸/۱۵۳)

17۔ ان کا نام مبارک بن محمد بن محمد بن عبدالکریم شیبانی جزری ہے۔ کنیت ابوالسعادات ہے۔ آپ محدث اور ماہر لغت تھے۔ جزیرۂ ابن عمر میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ اس کے بعد موصل چلے آئے۔ آخری عمر میں بیمار ہو گئے اور ہاتھ پاؤں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ موت تک یہ بیماری رہی یہاں تک کہ موصل کے ایک گاؤں میں فرشتہ اجل کو لبیک کہا۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی تمام کتابیں بیماری کی حالت میں لکھیں۔ اپنے طلبہ کو املا کرا دیتے۔ ان کی کتابوں میں النہایہ فی غریب الحدیث، جامع الاصول فی احادیث الرسول، الانصاف فی الجمع بین الکشف والکشاف، المرصع فی الآباء والامہات والبنات، الشافی فی شرح مسند الشافعی، المختار فی مناقب

الاخبار، تجرید اسماء الصحابہ، منال الطالب فی شرح طوال الغرائب، شامل ہیں۔ ۶۳۰ھ میں ان وفات ہوئی۔ (الاعلام، زرکلی: ۴/۳۳۱)

18۔ ان کا نام حسن بن عبد الرحمن خلاد رامہرمزی فارسی اور ابو محمد کنیت ہے۔ قاضی، ادیب اور اپنے زمانے کے محدث عجم تھے۔ امام ذہبی ان کی کتاب "المحدث الفاصل" کے بارے میں فرماتے ہیں: "کیا ہی خوب کتاب ہے"۔ شاعر تھے۔ ان کی کتابوں میں ربیع المتیم، الامثال، نوادر، الرثاء والتعازی اور ادب الناطق شامل ہیں۔ (دیکھیے: الاعلام، زرکلی: ۲/۱۹۴)

19۔ ان کا نام محمد بن عبد اللہ بن محمد بن حمدویہ، ابو عبد اللہ الحاکم ہے۔ امام، حافظ، ناقد، علامہ اور شیخ المحدثین۔ تصنیف وتخریج، جرح وتعدیل اور تصحیح وتعلیل میں ماہر اور علم کے سمندر تھے۔ مزاج میں ہلکا سا تشیع تھا۔ ان کی کتابوں میں معرفۃ علوم الحدیث، مستدرک الصحیحین، تاریخ النیسابوریین، مزکی الاخبار، المدخل الی علم الصحیح، الاکلیل اور فضائل الشافعی وغیرہ شامل ہیں۔ ۴۰۵ھ میں وفات ہوئی۔ (دیکھیے: سیر اعلام النبلاء، ذہبی: ۱۷/۱۶۲)

20۔ دیوان المبتدأ والخبر في تاریخ العرب والبربر ومن عاصرھم من ذوي الشأن الأکبر المعروف بتاریخ ابن خلدون، عبد الرحمن بن محمد بن محمد، ابن خلدون أبوزید، ولي الدین الحضرمي الإشبیلي، تحقیق: خلیل شحادۃ، ن: دار الفکر، بیروت، ط الثانیۃ: 1408ھ: 1988م، (ص: 559)

21۔ ان کا نام ابوبکر احمد بن علی بن ثابت بن احمد بن مہدی بغدادی ہے۔ اپنے زمانے سب سے بڑے حافظ حدیث، ہم عصروں پر فائق، صاحب تصانیف، خاتمۂ حفاظ، جمع وتصنیف، تصحیح وتعلیل، جرح وتعدیل اور تاریخ میں ماہر۔ قرآن پاک کی تلاوت بہت زیادہ کرتے۔ پچاس سے زیادہ کتابیں لکھیں، ان میں: التاریخ، شرف اصحاب الحدیث، الکفایۃ فی علم الروایۃ اور الفقیہ والمتفقہ شامل ہیں۔ ۴۶۳ھ وفات ہوئی۔ (دیکھیے: سیر اعلام النبلاء، ذہبی: ۱۸/۲۷۰)

22۔ ان کا نام عیاض بن موسی بن عیاض یحصبی اور کنیت ابو الفضل بستی ہے۔ ان کی تصانیف مفید ہیں۔ قاضی عیاض کا علم پھیلا اور نام مشہور ہوا۔ ان کی کتابوں میں الشفاء فی شرف المصطفی، ترتیب المدارک وتقریب المسالک، العقیدہ، شرح حدیث ام زرع، جامع التاریخ اور مشارق الانوار شامل ہیں۔ ۵۴۴ھ وفات ہوئی۔ (دیکھیے: تاریخ الاسلام، ذہبی: ۱۱/۸۶۰)

23۔ ان کا نام عمر بن عبد المجید بن عمر بن حسین، ابو حفص قرشی ہے۔ مکہ مکرمہ میں جمادی الاولی کے مہینے سنہ ۵۸۱ھ میں وفات ہوئی۔ مضبوط محدث اور نیک انسان تھے۔ (دیکھیے: تاریخ الاسلام، ذہبی: ۱۲/۷۳۶)

24۔ منهج النقد في علوم الحدیث، نور الدین محمد عتر الحلبي، ن: دار الفکر، دمشق-سوریۃ، ط الثالثۃ: 1418ھ: 1997م، (ص: 64)

25۔ ان کا نام تقی الدین، ابو عمرو عثمان بن مفتی صلاح الدین عبد الرحمن بن عثمان بن موسی کردی، شہرزوری ہے۔ اپنے والد سے فہم دین حاصل کیا۔ دمشق میں مدرسۂ اشرفیہ کے شیخ الحدیث رہے ۶۴۳ھ میں وفات ہوئی۔ (دیکھیے: سیر اعلام النبلاء، ذہبی: ۲۳/۱۴۰)

26۔ ان کا نام عزالدین عبد العزیز بن محمد بن جماعہ الکنانی ہے۔ ابو حیان سے علم نحو حاصل کیا۔ مصر کے لمبے عرصے تک قاضی رہے۔ حرمین میں آخری گزارنے خواہش تھی، لہذا قضا کے عہدے سے استعفا دیا۔ اس کے بعد حج کیا اور مکہ مکرمہ کے قبرستان "معلی" میں فضیل بن عیاض ابو القاسم قشیری کے پہلو میں دفن ہوئے۔ ۷۶۶ھ میں فوت ہوئے۔ آپ نے کئی کتابیں بھی لکھیں، ان میں "مناسک الحج علی المذاہب الاربعہ" بھی شامل ہے۔ آپ بھلے اور نیک انسان تھے۔ (دیکھیے: العقد المذہب فی حملۃ المذہب لابن الملقن، ص: ۴۱۱، وجلاء العینین فی محاکمۃ الاحمدین للعلامہ آلوسی، ص: ۳۹)

27۔ ان کا نام ابراہیم بن موسی بن ایوب شیخ برہان الدین اور کنیت ابو اسحاق تھی۔ قاہرہ میں شافعیہ کے بڑے رہ نماؤں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ فقہ واصول اور عربی زبان میں مہارت تھی۔ تدریس بہت زیادہ کی، فتوی اور تصنیف کا کام کیا۔ محرم کے مہینے میں حج سے واپس ہوتے ہوئے ۸۰۲ھ میں وفات پائی۔ (دیکھیے: ذیل التقیید فی رواۃ السنن والمسانید، ابو طیب مکی: ۱/۴۵۶)

28۔ آپ کا نام سراج الدین ابو حفص عمر بن رسلان بن نصیر بن صالح کنانی ہے۔ اپنے زمانے کے مجتہد اور آٹھویں صدی کے عالم تھے۔ فقہ، حدیث و اصول میں مہارت پیدا کی۔ افتا اور مختلف مذاہب کے علم میں حرف آخر تھے۔ اجتہاد کا رتبہ حاصل تھا۔ فقہ، حدیث اور تفسیر میں ان کی تصانیف بھی ہیں، ان میں حواشی الروضہ، شرح بخاری، شرح ترمذی، حواشی الکشاف شامل ہیں۔ بہاء بن عقیل فرماتے ہیں: اپنے زمانے میں فتوی دینے کے سب سے زیادہ حق دار تھے۔ ۱۰ ذی قعدہ ۸۰۵ھ میں وفات ہوئی۔ (دیکھیے: حسن المحاضرہ فی تاریخ مصر والقاہرہ، سیوطی: ۱/۳۲۹)

29۔ ان کا مکمل نام بدر الدین محمد بن عبد اللہ بن بہادر زرکشی ہے۔ آپ ۷۴۵ھ کو پیدا ہوئے۔ اسنوی، ابن کثیر، اذرعی وغیرہ سے علم حاصل کیا۔ کئی فنون میں تصانیف چھوڑیں۔ ان میں چند کے نام یہ ہیں: الخادم علی الرافعی والروضہ، شرح المنہاج، الدیباج، شرح جمع الجوامع، شرح البخاری، التنقیح علی البخاری، شرح التنبیہ، البرہان فی علوم القرآن، القواعد فی الفقہ، احکام المساجد، تخریج احادیث الرافعی، تفسیر القرآن۔ یہ کتاب آپ سورت مریم تک ہی لکھ پائے۔ البحر فی الاصول، سلاسل الذہب فی الاصول والنکت علی ابن الصلاح۔ ان کے علاوہ دیگر کتابیں بھی ہیں۔ ۳ رجب، بروز اتوار، ۷۹۴ھ میں وفات ہوئی۔ (حسن المحاضرہ فی اخبار مصر والقاہرہ، سیوطی:

۱/۴۳۷)

30۔ ان کا مکمل نام: ابوالفضل احمد بن علی بن محمد بن محمد بن علی عسقلانی ہے۔ ۷۷۳ھ میں ولادت ہوئی۔ ابتدا میں ادب وعلم شعر کی طرف توجہ کی اور درجۂ کمال کو پہنچے اس کے بعد حدیث کی طرف توجہ کی۔ حافظ ابوالفضل زین الدین عراقی کی شاگردی اختیار کی۔ علم حدیث کے تمام فنون میں گوے سبقت لے گئے۔ حدیث کے میدان میں تمام دنیا میں حرف آخر تھے۔ ان کے زمانے میں کوئی اور حافظ حدیث نہ تھا۔ بہت سی کتابیں لکھیں، مثال کے طور پر: شرح بخاری، تعلیق التعلیق، تہذیب التہذیب، تقریب التہذیب وغیرہ۔ ۸۵۲ھ وفات ہوئی۔ (دیکھیے: حسن المحاضرۃ فی تاریخ مصر والقاہرۃ، سیوطی: ۱/۳۶۳)

31۔ ان کا نام نام: یحیی بن شرف بن مری بن حسن بن حسین بن حزام بن محمد بن جمعہ نووی ہے۔ ابوزکریا کنیت ہے۔ شافعی مسلک کے مدون تھے۔ الروضہ، مجموع اور المنہاج کے نام سے کتابیں لکھیں۔ ۲۴ رجب کی شب، ۶۷۶ھ میں وفات ہوئی۔ (دیکھیے: طبقات الشافعیۃ الکبری، تاج الدین سبکی: ۸/۳۹۵، طبقات الشافعیین، ابن کثیر، ص: ۹۱۳)

32۔ ان کا نام: ابراہیم بن عمر بن ابراہیم شیخ برہان الدین جعبری اور کنیت: ابواسحاق ہے۔ ۶۴۰ھ کی حدود میں پیدایش ہوئی۔ آپ فقیہ، قاری اور کئی فنون کے ماہر تھے۔ قراءات، حدیث اور اسماے رجال میں آپ کی تصانیف ہیں۔ ماہ رمضان، ۷۳۲ھ میں وفات ہوئی۔ (دیکھیے: طبقات الشافعیۃ، تاج الدین سبکی: ۹/۳۹۹)

33۔ آپ کا نام: بدر الدین محمد بن ابراہیم بن سعد اللہ بن جماعہ، کنانی حموی ہے۔ مصر کے چیف جسٹس رہے۔ ۶۳۹ھ میں ولادت ہوئی۔ بہت سے علوم حاصل کیے اور بہت سے فنون میں لکھا۔ مدرسۂ کاملیہ وغیرہ میں تدریس وحدیث پڑھانے میں مشغول رہے۔ ۷۳۳ھ میں وفات ہوئی۔ (حسن المحاضرۃ فی اخبار مصر والقاہرۃ، سیوطی: ۱/۴۲۵)

34۔ ان کا نام: حسین بن محمد بن عبد اللہ شرف الدین طیبی ہے۔ حدیث، تفسیر وعلم بیان کے عالم تھے۔ وراثت و تجارت کی بنا پر بڑے صاحب ثروت تھے۔ اپنا مال بھلائی کے کاموں خرچ کر دیا، یہاں تک کہ آخری عمر میں فقیر ہوگئے۔ بدعتی لوگوں پر سختی سے تنقید کرتے۔ طلبۂ علم کو ہمیشہ پڑھایا۔ بلاغت، تفسیر و حدیث میں ان کی تالیفات ہیں۔ (دیکھیے: الدرر الکامنہ، ابن حجر عسقلانی: ۲/۶۸ و ۶۹، کشف الظنون، حاجی خلیفہ: ۱/۷۲۰)

35۔ ان کا نام علاء الدین، علی بن عثمان بن ابراہیم بن مصطفی ماردینی ہے۔ ۷۸۳ھ میں ولادت ہوئی۔ فقہ، اصول اور حدیث کے امام تھے۔ ہمیشہ مصروف اور دوسروں کی علمی پیاس بجھانے میں لگے رہتے۔ ان کی تصانیف انوکھی ہیں، مثال کے طور پر، مختصر الہدایہ، مختصر علوم الحدیث، الرد علی البیہقی۔ مصر میں قضا کے عہدے پر فائز رہے۔ محرم الحرام ۷۴۵ھ میں وفات ہوئی۔ (دیکھیے: حسن المحاضرۃ فی اخبار مصر والقاہرۃ، سیوطی: ۱/۴۶۹)

36۔ دیکھیے: ص ۸۷۔

37۔ ان کا نام اسماعیل بن عمر بن کثیر بن ضوء بن کثیر بن درع ہے۔ ابن کثیر کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کی مولفات میں "التکمیل، احکام التنبیہ، طبقات الشافعیہ وغیرہ شامل ہیں۔ ۷۰۱ھ میں پیدا ہوے اور ۷۷۴ھ میں وفات ہوئی۔ (دیکھیے: ذیل التقیید فی رواۃ السنن والاسانید، ابو طیب مکی: ۱/۴۷۱)

38۔ ان کا نام: سراج الدین ابوحفص عمر بن علی بن احمد بن محمد انصاری ہے۔ ۷۲۳ھ ولادت ہوئی۔ جوانی میں تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگئے۔ اپنے زمانے میں سب سے زیادہ تصانیف انھی کی ہیں۔ آپ کی تصانیف میں: "شرح بخاری، شرح العمدۃ، الاشباہ والنظائر، وغیرہ شامل ہیں۔ ماہ ربیع الاول ۸۰۴ھ میں وفات ہوئی۔ (دیکھیے: حسن المحاضرۃ فی اخبار مصر والقاہرۃ، سیوطی: ۱/۴۳۸)

39۔ آپ کا مکمل نام: طاہر بن حسن بن عمر بن حسن بن عمر بن حبیب بن شریح حلبی، زین الدین ابوالعز ابن بدرالدین ہے۔ قصیدۂ بردہ کی ایک شرح لکھی۔ اپنے والد کی "تاریخ" پر انھی کے انداز میں تکملہ لکھا، تلخیص المفتاح کو نظمایا۔ ماہ ذی الحج ۸۰۸ھ میں وفات ہوئی۔ (دیکھیے: انباء الغمر بابناء العمر، ابن حجر عسقلانی: ۲/۳۳۸)

۲/۳۳۸۔40

41۔ دیکھیے: لحظ الألحاظ بذیل طبقات الحفاظ، محمد بن محمد بن محمد، أبو الفضل تقي الدين ابن فهد الهاشمي العلوي الأصفوني ثم المكي الشافعي، ن: دار الكتب العلمية، ط الأولى: 1419هـ - 1998م، (صـ: 150)، والضوء اللامع لأهل القرن التاسع، شمس الدين أبو الخير محمد بن عبد الرحمن بن محمد بن أبي بكر بن عثمان بن محمد السخاوي، ن: منشورات دار مكتبة الحياة، بيروت، (4/173)، تاریخ اشاعت مذکور نہیں۔

امام ابن دقیق العید کا مکمل نام: محمد بن علی بن وہب بن مطیع اور کنیت ابوالفتح ہے۔ ابن دقیق العید کے نام سے مشہور ہیں۔ مسلک کے اعتبار سے شافعی تھے۔ مصر کے رہنے والے تھے۔ آپ چیف جسٹس اور اپنے زمانے کا بڑا نام تھے۔ بہترین محدث، صاحب تحقیق فقیہ واصولی، ادیب، شاعر، نحوی، بہت زیادہ عقل مند، خاموش طبع، زہد میں کامل، دین پر شدت سے عامل، راتوں کو ہمیشہ جاگ کر مطالعے میں مگن اور سخی انسان تھے۔ آپ نے اچھوتی تصانیف چھوڑیں، مثال کے طور پر: الامام، الالمام، علوم الحدیث، شرح عمدۃ الاحکام، شرح مقدمۃ المطرز فی اصول الفقہ، اربعین فی الروایۃ عن

رب العالمین، شرح مختصر ابن الحاجب۔ (فوات الوفیات، محمد بن شاکر صلاح الدین: ۳/۴۴۳)

42۔ ان کا نام محمد بن احمد بن عثمان بن قایماز بن عبد اللہ اور کنیت ابو عبد اللہ ہے۔ قرآن کے قاری اور ذہبی کے لقب سے مشہور ہیں۔ حدیث کا علم حاصل کیا، تصنیف کے کام سے وابستہ رہے، تاریخ کے موضوع پر کتابیں لکھیں، احادیث کی تصحیح اور ان کی علل کو واضح کیا۔ قراءات سبعہ محمد بن عبد العزیز دمیاطی اور محمد بن منصور حارثی سے پڑھیں۔ خیر خواہی میں مشہور تھے۔ متواضع، اچھے اخلاق کے مالک، عبادت گزار اور خوش کلام تھے۔ ان کی عمدہ تصانیف ہیں، مثال کے طور پر: میزان الاعتدال، الکاشف، الموقظۃ وغیرہ۔ ۷۴۸ھ دمشق میں وفات ہوئی۔ (دیکھیے: معجم الشیوخ، تاج الدین سبکی: ص: ۳۵۴)

43۔ ان کا نام: علی بن محمد بن علی حسینی اور کنیت ابو الحسن ہے۔ آپ شریف جرجانی اور سید شریف کے لقب سے مشہور تھے۔ فلسفہ، تفسیر، منطق کے ماہر اور دیگر علوم سے بھی وابستگی رکھتے تھے۔ جرجان میں تعلیم حاصل کی۔ مصر جا کر برقی اور مبارک شاہ وغیرہ سے پڑھا۔ یہاں آپ کا قیام چار سال رہا۔ آخر میں شیراز کو اپنا وطن بنا لیا۔ آپ کی تقریباً ۵۰ تالیفات ہیں: مثال کے طور پر، تفسیر الزہراوین، بیضاوی کا حاشیہ اور زمخشری کی کشاف کا حاشیہ۔ ۸۱۶ھ میں وفات ہوئی۔ (معجم المفسرین، عادل نویہض: ۱/۳۸۰)

44۔ ان کا نام محمد بن عبد الرحمن، شمس الدین سخاوی ہے۔ تاریخ دان، حدیث، تفسیر و ادب کے عالم تھے۔ قاہرہ میں پیدا ہوئے اور مدینہ میں فوت ہوئے۔ ملکوں کے لمبے اسفار کیے۔ ۲۰۰ کے قریب کتابیں لکھیں۔ آپ کی مشہور کتابیں یہ ہیں: ''الضوء اللامع فی اعیان القرن التاسع'' ۱۲ جلد، شرح الفیۃ العراقی اور المقاصد الحسنۃ۔ ۹۰۲ھ میں خالق ازل کو لبیک کہا۔ (الاعلام، زرکلی: ۶/۱۹۴)

45۔ ۱/۱۵۶

46۔ ان کا نام: جلال الدین عبد الرحمن بن ابو بکر بن محمد بن سابق الدین خضیری سیوطی ہے۔ آپ حافظ حدیث، مورخ و ادیب تھے۔ ۶۰۰ کے قریب کتابیں لکھیں۔ بعض کتابیں بڑی ہیں اور بعض چھوٹے رسالوں کی شکل میں ہیں۔ قاہرہ میں یتیمی کی حالت میں پلے بڑھے۔ چالیس سال کی عمر ہوئی تو لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اپنی جان پہچان والوں سے بھی ملنا چھوڑ دیا، گویا کسی کو جانتے ہی نہیں۔ اسی زمانے میں آپ نے اپنی اکثر کتابیں لکھیں۔ آپ کی مشہور کتابوں میں الاتقان فی علوم القرآن، تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی اور المزہر فی اللغۃ شامل ہیں۔ ۹۱۱ھ وفات ہوئی۔ (دیکھیے: الاعلام، زرکلی: ۳/۳۱۰)

47۔ ان کا نام: عمر (یاطہ) بن محمد بن فتوح بیقونی ہے۔ مصطلح الحدیث کے عالم تھے۔ دمشق کے رہنے والے اور شافعی مسلک سے تعلق تھا۔ منظومۂ بیقونیہ ان کی وجہ شہرت ہے۔ محمد بن عثمان میرغنی وغیرہ نے اس کی شرح لکھی ہے۔ ۱۰۸۰ھ وفات پائی۔ (الاعلام، زرکلی: ۵/۶۴)

48۔ ان کا نام: محمد بن اسماعیل بن صلاح بن محمد حسنی ہے۔ سبل السلام جیسی کتاب کے مصنف ہیں۔ اپنے آباء واجداد کی طرح ''امیر'' کے لقب سے مشہور ہیں۔ مجتہد اور بڑے ائمہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے والد بھی زاہد اور فاضل انسان تھے۔ صنعاء میں علامہ زید بن محمد بن حسن اور علامہ صلاح اخفش و دیگر علما سے علم حاصل کیا۔ ۱۱۸۲ھ وفات ہوئی۔ (الاعلام، زرکلی: ۸/۵۷۵)

49۔ ان کا نام: علی بن سلطان محمد، نور الدین ملا ہروی قاری ہے۔ حنفی فقیہ تھے۔ اپنے زمانے میں علمی صدارت کے حامل تھے۔ ہرات شہر میں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد مکہ چلے گئے اور وہیں فوت ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق یہ ہر سال قراءات و تفسیر سے مزین ایک قرآن پاک لکھ کر اسے بیچ دیتے اور اسے حاصل ہونے والی رقم انہیں پورے سال کے لیے کافی ہو جاتی۔ آپ نے بہت ساری کتابیں لکھیں۔ ان میں تفسیر القرآن (تین جلد)، الاثمار الجنیۃ فی اسماء الحنفیۃ، الفصول المہمۃ (فقہ کے موضوع پر)، مناسک، شرح مشکاۃ المصابیح، شرح مشکلات الموطا، شرح الشفاء، شرح حصن حصین (حدیث کے موضوع پر)، شرح الشمائل، شامل ہیں۔ آپ کی وفات ۱۰۱۴ھ ہوئی۔ (الاعلام، زرکلی: ۵/۱۲)

50۔ ان کا نام: جمال الدین بن محمد سعید بن قاسم ابو الفرج ہے۔ کئی علوم سے وابستگی تھی۔ ملک شام میں فنون ادب اور علم دین میں مہارت کے لحاظ سے امام مانے جاتے تھے۔ پیدائش اور وفات دونوں دمشق میں ہوئی۔ عقیدے کے اعتبار سے سلفی اور تقلید کے منکر تھے۔ ادب، تفسیر اور شریعت اسلامی میں عمومی اور خصوصی لیکچرز دیے۔ مجلات اور اخباروں میں بہت سے مقالات لکھے۔ بہت سی مفید تالیفات آپ کی یادگار ہیں۔ ۲۳ جمادی الاولی ۱۳۳۲ھ میں وفات ہوئی۔ (موسوعۃ مواقف السلف فی العقیدۃ والمنہج والتربیۃ، ابو سہل مغراوی: ۹/۱۸۶)

51۔ ان کا نام: طاہر بن محمد بن صالح بن احمد بن موہب سمعونی، جزائری ہے۔ دمشق میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ مدرسہ جقمقیہ میں داخل ہوئے۔ استاد عبد الرحمن بستانی سے علم حاصل کیا اس کے بعد علامہ عبد الغنی غنیمی میدانی کے ساتھ ان کی وفات تک وابستہ رہے۔ دمشق میں مالکی مذہب کے فقیہ تھے اور شام کے مفتی۔ آپ کی تالیفات میں الجواہر الکلامیۃ فی ایضاح العقیدۃ الاسلامیۃ، تنبیہ الاذکیاء فی قصص الانبیاء، توجیہ النظر الی علم الاثر اور التبیان لبعض المباحث المتعلقۃ بالقرآن، شامل

ہیں۔ دمشق میں ۱۳۳۸ھ میں وفات ہوئی۔ (موسوعۃ السلف فی العقیدۃ والمنہج والتربیۃ، ابوسہل مغراوی: ۹/۱۹۳)

52۔ ان کا نام: محمد بن محمد بن سویلم ابوشہبہ ہے۔ مصر کے گاؤں ”منیہ جناج“ میں ۱۳۳۲ھ کو پیدا ہوئے۔ مصر و دیگر ملکوں کے بلند پایہ علمی، دینی و ادبی مجلات میں لکھا۔ بہت سے لیکچرز دیے اور بہت سی علمی محافل میں شریک رہے۔ علوم قرآن، سنت نبوی، فقہ، شریعت، سیرت نبوی، مستشرقین، عیسائی مبلغین اور ملحدین کے رد پر کتابیں لکھیں۔ آپ کی تالیفات میں الاسرائیلیات والموضوعات فی کتب التفسیر، السیرۃ النبویۃ علی ضوء القرآن والسنۃ، الوسیط فی علوم و مصطلح الحدیث، دفاع عن السنۃ ورد شبہ المستشرقین، شامل ہیں۔ ۱۴۰۳ھ میں وفات ہوئی۔

http://shamela.ws/index.php/author/1378

53۔ ان کا نام: ابوحفص محمود بن احمد بن محمود طحان نعیمی ہے۔ ایک قول کے مطابق آپ کا سادات خاندان سے تعلق ہے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ہیں۔ شام کے شہر حلب کے رہنے والے تھے۔ آپ کے اساتذہ میں شیخ محمد ابوزہو رحمہ اللہ شامل ہیں، جنھوں نے ”الحدیث والمحدثون“ کے نام سے کتاب لکھی۔ استاد محمود طحان کی کتابوں میں تیسیر مصطلح الحدیث، اصول التخریج ودراسۃ الاسانید شامل ہیں۔

http://shamela.ws/index.php/author/1269

54۔ آپ کا نام: عبداللہ بن یوسف بن عیسی بن یعقوب جدیع عنزی ہے۔ آپ نے بڑی تعداد میں مقالے لکھے۔ یورپین کونسل برائے افتاء و تحقیق کے رکن ہیں۔ لیڈز گرینڈ مسجد کے شرعی مشیر ہیں۔ آپ کی تالیفات میں تیسیر اصول فقہ اور علل الحدیث شامل ہیں۔

http://muntada.islamtoday.net/t37387.html

55۔ آپ کا نام: نور الدین عتر ہے۔ ۱۹۳۷ء میں شہر حلب میں پیدا ہوئے۔ آپ کا گھرانہ علم، نیکی اور کتاب و سنت سے جڑا ہوا تھا۔ جامعہ ازہر سے پڑھا۔ چالیس سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ ان میں مشہور کتابیں یہ ہیں: منہج النقد فی علوم الحدیث، الامام الترمذی والموازنۃ بین جامعہ وبین الصحیحین، اصول الجرح والتعدیل۔ دمشق میں ازہر یونی ورسٹی کی شاخ میں علوم القرآن وحدیث کے رئیس رہے۔ (دیکھیے: محمد حمید اللہ وأمین التراث الإسلامي في الغرب، سید عبدالماجد الغوري، صـ۹)

ترجمہ، تلخیص و حواشی: فضل الرحمٰن محمود

سُنّتوں کا تنوُّع

ایک تجزیاتی مطالعہ

ابو الاعلیٰ سیّد سبحانی

امت کے فکر مند اصحاب علم نے ہر زمانے میں امت کو درپیش مسائل کے حل تلاش کرنے کی اپنی اپنی حد تک کی کوششیں کی ہیں، اس سلسلے میں مختلف انداز اور مختلف طریقہ ہائے فکر و نظر رہے ہیں، رائیں بھی مختلف رہی ہیں اور مشورے بھی مختلف رہے ہیں۔ گزشتہ چند صدیوں کا جائزہ لیا جائے تو برصغیر میں شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمہ، علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمہ اور علامہ فراہی علیہ الرحمہ اور ان کے بعد ان کی فکر کے علمبردار اصحاب علم و فکر نے اِس سلسلے میں نمایاں کوششیں کی ہیں۔ بیسویں صدی میں سید مودودی علیہ الرحمہ کا نام امت کے فکر مند اصحاب علم و دانش میں سرفہرست ہے، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی علیہ الرحمہ کی تحریریں فکر و نظر کا ایک وسیع میدان فراہم کرتی ہیں(۱)۔

نماز اتحاد امت کی بنیاد ہے(۲)، تاہم امت اسلامیہ کے اندر موجود اختلافات کی درجہ بندی کی جائے اور ان کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو سرفہرست وہ اختلافات آئیں گے جن کا تعلق نماز سے ہے، یہ صورتحال کا بہت ہی افسوسناک پہلو ہے۔ چنانچہ مختلف زمانوں میں امت کے فکر مند اصحاب علم و دانش نے اس پر اپنے اپنے انداز سے کام کیا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی علیہ الرحمہ طریقہ نماز سے متعلق اختلافات کے سلسلہ میں بہت ہی واضح نقطہ نظر رکھتے تھے، لکھتے ہیں:

”اہل حدیث، حنفی، مالکی، حنبلی اور شافعی جن جن طریقوں سے نماز پڑھتے ہیں وہ سب طریقے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں اور ہر ایک نے معتبر روایات ہی سے اس کو لیا ہے۔ اسی بنا پر ان میں سے کسی گروہ کے اکابر علماء نے یہ نہیں کہا کہ ان کے طریقے کے سوا جو شخص کسی دوسرے طریقے پر نماز پڑھتا ہے اس کی نماز نہیں ہوتی۔ یہ صرف بے علم لوگوں کا ہی کام ہے کہ وہ کسی شخص کو اپنے طریقے کے سوا دوسرے طریقے پر نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر اسے ملامت کرتے ہیں۔ تحقیق یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اوقات میں ان سب طریقوں سے نماز پڑھی ہے۔ اختلاف اگر ہے تو صرف اس امر میں کہ آپ عموماً کس طریقے پر عمل فرماتے تھے۔ جس گروہ کے نزدیک جو طریقہ آپ کا معمول کا طریقہ ثابت ہوا ہے اس نے وہی طریقہ اختیار کر لیا ہے۔“(۳)

مولانا نہ صرف سنتوں کے تنوع کے قائل ہیں، بلکہ اس تنوع پر عمل کو مستحسن قرار دیتے ہیں اور اس پر نکیر کو اتباع پیغمبر پر نکیر قرار دیتے ہیں:

”لیکن یہ واضح رہے کہ سوال صرف ترجیح کا ہے نہ کہ رد و قبول کا۔ ائمہ سلف میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ جن مختلف طریقوں کا ذکر مذکورہ بالا احادیث میں آیا ہے ان میں سے کسی پر حضور نے عمل نہیں کیا تھا۔ بلکہ کہتے صرف یہ ہیں کہ جس خاص طریقہ کو ہم نے مرجح قرار دیا ہے وہ حضور کا عام معمول تھا اور دوسرے طریقوں پر آپ کبھی کبھی عمل کر لیتے تھے۔ پس جب معاملہ کی حقیقت یہ ہے تو ان طریقوں میں سے جس پر بھی کوئی عمل کر رہا ہے، حدیث ہی کی پیروی کر رہا ہے اور اس پر نکیر کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اتباع پیغمبر پر نکیر کی جاتی ہے جس کی جرأت مقلدین کو بھی زیبا نہیں کجا کہ اہل حدیث اس کا ارتکاب کریں۔ پھر اگر کوئی شخص ان طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ پر جامد ہونے کے بجائے وقتاً فوقتاً ان سب طریقوں پر عمل کرتا رہے جو حدیث میں مذکور ہیں تو یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ صحیح و مکمل پیروی ہوگی، اور لفظ عمل بالحدیث کا اطلاق اس طرز عمل پر زیادہ صحیح معنی میں ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ابتداء ہی میں ایک طریقہ کو ترجیح دینے اور باقی سب طریقوں کو ترک کر دینے کے بجائے ان سب طریقوں کو نماز میں

اختیار کرنے کی گنجائش رکھی جاتی تو شاید بعد کے ادوار میں وہ جمود و تعصب پیدا ہی نہ ہوتا جس کی بدولت نوبت یہ آگئی ہے کہ لوگ نماز کی جس صورت کے عادی ہیں اس سے ذرا بھی مختلف صورت جہاں انہوں نے دیکھی اور بس وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس شخص کا دین بدل گیا ہے اور یہ ہماری امت سے نکل کر دوسری امت میں جا ملا ہے"۔(۴)

فقہی مسالک کے سلسلے میں بھی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی علیہ الرحمہ نے اسی پہلو سے گفتگو فرمائی ہے۔(۵)

مولانا مودودی علیہ الرحمہ سے پہلے بھی سنتوں کے تنوع پر مختلف اہل علم نے اپنے اپنے انداز سے قلم اٹھایا ہے، اس ضمن میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمہ کی شخصیت قابل ذکر ہے، پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی اپنی کتاب "سنتوں کا تنوع" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"دوسرے صاحبان فکر وبصیرت کی مانند حضرت شاہؒ نے بھی سراغ لگایا کہ ہر مسلک و فکر کی بنیاد کسی نہ کسی اصل بلکہ مضبوط اصل (اصل اصیل) پر قائم ہے۔ انہوں نے "اصل السنۃ" اور اس کی وجوہ اور شکلوں کی سب سے زیادہ وضاحت کی۔ ظاہر حدیث اور مجموعی تناظر میں حدیث و سنت کا بنیادی فرق جانا اور واضح کیا۔ فقہی اختلافات کی دوسری وجوہ کو بھی خوب بیان کیا۔ وہ ترجیح دینے کے بھی قائل ہیں اور مختلف احادیث و سنن میں تطبیق دینے کے تو امام ہیں۔ اسی بنا پر وہ فقہی خلیج کو پاٹ کر امت میں اتحاد فکر و عمل پیدا کرنا چاہتے ہیں۔"(۶)

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی علم و تحقیق کی دنیا کا ایک بڑا نام ہے، موصوف کی زندگی علم و تعلیم اور تصنیف و تحقیق سے عبارت ہے، یقیناً شعبہ اسلامیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی خدمات کا تذکرہ موصوف کے ذکرِ خیر کے بغیر نامکمل رہے گا۔ پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی کی کتاب "سنتوں کا تنوع۔ ہر سنت نبوی افضل ہے" اپنے موضوع پر ایک قابل قدر تصنیف ہے۔ یہ کتاب سنتوں کے تنوع سے متعلق شاہ ولی اللہ اور سید مودودی (۷) کے نقطہ نظر کو مفصل انداز میں پیش کرنے والی پہلی باقاعدہ کتاب ہے۔

مقدمہ کتاب میں مصنف موصوف لکھتے ہیں:

"مجتہدین کے اجتہادِ خالص پر مبنی ہوں یا متنوع و مختلف احادیث و سنن پر قائم ہوں، تمام فقہی و مسلکی اختلافات بنیادی طور سے کتاب و سنت ہی پر محمول کیے جاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ تمام اماموں نے مختلف سنتوں ہی میں سے کسی نہ کسی سے تمسک کیا ہے اور اسی پر اپنی فقہی فکر و عمل کی بنیاد رکھی ہے"۔(۸)

آگے لکھتے ہیں:

"مختصراً یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ رسول اکرمؐ نے کبھی ایک وجہِ سنت پر عمل فرمایا یا ایک جہتِ حدیث بیان فرمائی اور کبھی دوسری، بسا اوقات ان کی کئی کئی وجوہ و جہات ملتی ہیں۔ اور نہ صرف ان رنگارنگ سنتوں پر بنفس نفیس عمل فرمایا بلکہ ان ہی کی تعلیم صحابہ کرام کو الگ الگ دی۔ کسی کو ایک وجہِ سنت سکھائی اور کسی کو دوسری، کسی اور صحابی کو تیسری اور بسا اوقات یہ تعداد دس بارہ سے بھی تجاوز کر گئی۔ ہر صحابی نے اپنی سیکھی ہوئی سنت پر عمل کیا اور دوسرے صحابہ کو وہی سکھائی اور دوسرے مسلمانوں اور شاگردوں کو اسی خاص سنت کی تعلیم دی۔ اسی طرح صحابہ کرام میں ایک ہی معاملہ سے متعلق نوع بہ نوع سنتیں رواج پاگئیں اور سنتوں کا یہی تنوع تابعین کرام کو ورثہ میں ملا اور ان سے بعد کے لوگوں کو اور امامانِ فقہ اور مجتہدین امت نے اپنے اپنے شیوخ و اساتذہ کے واسطے سے صحابہ کرام اور ان کے ذریعہ سنن نبوی کا تنوع پایا۔ روایت و درایت کے اعتبار سے کس کا کیا پایہ ہے اس کا تعلق فن حدیث و سنت سے ہے اور خالص تکنیکی ہے۔ رسول اکرمؐ کی ہر ثابت شدہ حدیث و سنت نہ صرف ہم پلہ و ہم سر ہے بلکہ ہر ایک افضل واصح اور صحیح ترین ہے، صرف اس بنا پر کہ وہ سنت نبوی ہے۔"(۹)

آگے مزید لکھتے ہیں:

"اس مختصر کتاب کا مقصود صرف اسی حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ رسول اکرمؐ کی ہر سنت افضل وصحیح ترین ہے"۔(۱۰)

کتاب کا بڑا حصہ نماز کی متنوع سنتوں پر مشتمل ہے، اس کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"طہارت کے مختصر باب یا بحث کے بعد سارا زور نماز کی متنوع سنتوں پر ہے کہ ان ہی میں تفرقہ بازی زیادہ کی جاتی ہے۔ اپنی پسندیدہ یا مختار وجہِ سنت کو واحد و مستقل سنت بتایا جاتا ہے اور دوسرے یا دوسروں کی پسندیدہ یا مختار سنتوں کو ہر طرح سے کمزور، ضعیف، اعتبار سے ساقط، ناقابل عمل حتیٰ کہ غلط بتایا جاتا ہے۔ یہ علمی یا اسلامی اندازِ فکر ہے اور نہ حدیثی تشریح و تعبیر۔ یہ خالص مسلکی جارحیت اور فقہی عصبیت ہے جو مردود ہے۔ صرف سلسلہ کلام کو منطقی انداز میں ختم کرنے کی خاطر دوسرے ابواب زکوٰۃ و صدقہ، روزہ و حج جیسی عبادات میں بھی بعض سنتوں کا تنوع واضح کیا گیا ہے"۔(۱۱)

کتاب کی تمہید کے اختتام پر دو ٹوک انداز میں لکھتے ہیں:

"اصل مقصد تو یہ بتانا ہے کہ سنتوں میں تنوع پایا جاتا ہے اور ان رنگارنگ سنتوں میں سے کسی پر بھی عمل ہو جائے اجر و ثواب، تقویٰ و طہارت اور تزکیہ و تعلیم سب کے لیے کافی شافی ہے۔"(۱۲)

مصنف کی یہ فکر بہت اہم ہے کہ جو سنتیں ثابت ہیں وہ سب افضل ہیں۔ اور ان میں کسی بھی سبب سے ترجیح دینا مناسب نہیں ہے۔ لکھتے ہیں:

”انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اپنی پسندیدہ اور مختار سنت نبوی کو راجح قرار دینے اور دوسری غیر مختار سنت کو مرجوح قرار دینے کا کوئی جواز ہے نہ بنیاد، اس کی فقہی اور حدیثی وجہِ ترجیح بھی نہیں ملے گی“۔(۱۳)

مزید لکھتے ہیں:

”اصل سنت نبوی یہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے ان تمام متنوع اور رنگ برنگی سنتوں پر خود بھی عمل فرمایا اور مختلف صحابہ کرام کو الگ الگ سنتیں ایک مسئلہ و معاملہ پر سکھائیں، لہٰذا وہ سب کی سب برابر فضیلت رکھتی ہیں“۔(۱۴)

کتاب کے آخر میں نتیجہ بحث کے طور پر بہت ہی قیمتی بات لکھتے ہیں:

”تمام بحث و مباحثہ اور تجزیہ و تنقید کا خالص اصولِ فکری اور اسوۂ عمل یہ نظر آتا ہے کہ تمام مسالکِ فقہ اور طبقات فکر اپنی اپنی اختیار کردہ سنتوں کو ہی مانیں اور ان کو افضل سمجھ کر ان پر عمل کریں اور ان کی تعلیم و اشاعت بھی خوب کریں۔ اب رہیں دوسروں کی اختیار کردہ سنتیں تو ان کے لیے رسول اکرمؐ کا اصول و عمل اختیار کریں کہ وہی اصل الاصول ہے۔ رسول اکرمؐ نے جب الگ الگ سنتیں صحابہ کرام اور ان کے ذریعہ مختلف طبقات صحابہ کو سکھائیں تو آپؐ کا مقصود ہی یہی تھا۔ وہ واضح کرتا ہے کہ تمام سنتیں افضل ہیں۔ رسول اکرمؐ بھی ان کو افضل و اصح سمجھتے تھے اور آپؐ کے صحابہ کرام بھی یہی سمجھتے تھے۔“(۱۵)

آگے ایک بہت ہی قیمتی اور عملی بات لکھتے ہیں:

”فکر و عمل نبوی سے ہی صحابہ کرام نے سیکھا تھا کہ وہ اپنی اپنی اختیار کردہ سنتوں کو افضل سمجھتے تھے اور ان پر عمل کرتے تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ دوسرے صحابہ کرام کی اختیار کردہ سنتوں کو بھی افضل ہی سمجھتے تھے اور ان پر عمل کرنے والوں پر نکیر نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کی بھی تحسین و تعریف کرتے تھے۔ یہی روش علماء تابعین اور ائمہ مجتہدین کی بھی رہی، اور متعدّد محدثین اور دوسرے اکابر کی بھی رہی۔“(۱۶)

کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف موصوف کی تحقیق کا نتیجہ اور نتیجے کے پیچھے کارفرما محرک بہت ہی اعلیٰ اور بلند ہے، یہ نکتہ بہت ہی اہم ہے کہ جو سنتیں ثابت ہیں وہ سب افضل ہیں اور ان میں کسی بھی سبب سے کسی کو کسی پر ترجیح دینا یا کسی کو کسی سے افضل قرار دینا مناسب نہیں ہے۔ لیکن سنت ثابت کیسے ہوتی ہے، اس سلسلے میں یہ کتاب کافی و شافی رہنمائی نہیں کرتی ہے۔ کیونکہ نماز کے طریقوں سے متعلق اختلافات کی ایک بڑی بنیاد یہی ہے کہ طریقہ نماز سے متعلق یہ اور یہ چیزیں سنت سے ثابت نہیں ہیں اور ان سے متعلق روایات کمزور اور غیر معتبر ہیں، اور بعض اعمال جیسے خواتین کی نماز کے مختلف طریقوں سے متعلق تو سرے سے کوئی صحیح روایت ہے ہی نہیں، ایسی صورت میں سنتوں کے تنوع کی پوری بحث پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔

پوری کتاب میں سنت بمعنی طریقہ رسول اور سنت بمقابلہ واجب و فرض کے درمیان بھی بہت زیادہ خلط مبحث پایا جاتا ہے۔ لکھتے ہیں: ”بہت سی سنتیں ایسی بھی ہیں جو فرض و واجب کی مانند صرف ایک رخ یا صرف ایک جہت رکھتی ہیں“(۱۷)، حالانکہ تنوع تو فرض میں بھی ہو سکتا ہے جیسے تیمم فرض ہے اور اس کے مختلف طریقے ہیں اور وہ سب فرض کے درجے کے ہیں۔

عام طور سے سنتوں کے تنوع میں احادیث کو دلیل بنایا گیا ہے، لیکن احادیث میں بہت سی ناقابل استناد روایتیں ہوتی ہیں، جیسے ہاتھ باندھنے کی سنتیں، لکھتے ہیں کہ ”مولانا سیالکوٹی نے حسب دستور مسلک صرف سینے پر ہاتھ باندھنے کی احادیث کو صحیح کہا ہے اور اسی کو واحد سنت قرار دیا ہے، بقیہ تمام احادیث و روایات کو ضعیف قرار دے کر ان سے استدلال کو غلط بتایا ہے“۔(۱۸)

چونکہ مصنف حدیث اور سنت کے درمیان فرق نہیں کرتے، اس لیے عملی تواتر کی دلیل پوری کتاب میں محض کہیں کہیں اور وہ بھی مختصر اشاروں کی صورت میں نظر آتی ہے، اس کو باقاعدہ استدلال کے طور پر کہیں نہیں پیش کرتے ہیں، مثال کے طور پر ہاتھ باندھنے کی سنتوں سے متعلق مولانا سیالکوٹی کا موقف پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”ان سنتوں کے تنوع کے باب میں ایک اور اہم حقیقت یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ محدثین کرام اور ان سے پہلے ائمہ مجتہدین نے اپنے زمانے کے صحابہ و تابعین اور امت کے دوسرے طبقات میں ان مختلف و متنوع سنتوں کے جاری ہونے کا عمل بھی دیکھا تھا۔ ان کا انحصار صرف روایت پر نہیں تھا۔ امام مالکؒ موطا میں جابجا اپنے اہل شہر اور اکابر مدینہ کے دستور و عمل کو سنت کی بنیاد بناتے ہیں، اور یہی دوسرے اکابر کا وطیرہ ہے۔“(۱۹)

لیکن آگے چل کر پھر اپنے پرانے ہی موقف کو دوہراتے ہوئے لکھتے ہیں:

”بہر حال احادیث کے مطابق تینوں طریقوں میں سے کسی ایک پر عمل کرنا سنت کی پیروی کرنا ہے“۔(۲۰)

مصنف حدیث میں عملی تواتر کو شامل کرتے ہیں یا نہیں، اس کی وضاحت کتاب میں کہیں موجود نہیں ہے۔ حدیث سے احکام اسلامی کے ثبوت سے متعلق مصنف کی گفتگو اس سلسلے میں وضاحت طلب ہے، لکھتے ہیں:

”نماز پنجگانہ کے اوقات، نمازوں کی رکعات، ان کی ہیئت، ارکان،

فرض و واجب، مسنون و مستحب احکام صرف حدیث پر مبنی ہیں"۔ (۲۱)

مذکورہ عبارت میں مصنف موصوف اگر حدیث میں عملی تواتر کو شامل سمجھتے ہیں تو بات درست ہو سکتی ہے، بصورت دیگر یہ بات کسی بھی طور درست نہیں ہے۔

گزشتہ دنوں ڈاکٹر محی الدین غازی کی کتاب "نماز کے اختلافات اور ان کا آسان حل" پر کافی بحث و مباحثے ہوئے، موصوف بھی سنتوں کے باب میں تنوع کے قائل ہیں اور سنتوں کے درمیان کسی قسم کی ترجیح یا تفاضل کو وہ بھی درست نہیں مانتے، تاہم دونوں کے موقف کے درمیان سب سے واضح اور بنیادی فرق یہ ہے کہ ڈاکٹر محی الدین غازی کے ہاں عملی تواتر سنتوں کے تنوع کی سب سے بڑی دلیل اور سب سے بڑی بنیاد ہے، جو سنتوں کے تنوع پر ہونے والے تمام ہی اعتراضات کا از خود ازالہ کر دیتی ہے، جبکہ پروفیسر لیٹین مظہر صدیقی صاحب سنتوں کے تنوع کی بنیاد سنتوں کے ثبوت کو قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر محی الدین غازی اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نماز کے مختلف اعمال کا تذکرہ مختلف راویوں نے کیا، یہ تذکرے ہم تک حدیث کی کتابوں میں مدون ہو کر راویوں کے الفاظ کی صورت میں پہنچے، ان تذکروں کی حیثیت قولی روایت کی ہے، قولی روایتوں میں تواتر شاذ و نادر ہی ملتا ہے، زیادہ تر اخبار آحاد ہیں، جن میں کچھ روایتیں صحیح ذریعہ سے پہنچی ہیں اور کچھ کمزور ذریعہ سے، تاہم جو حقیقت ذہن نشین رہنی چاہیے وہ یہ کہ امت نے نماز پڑھنی ان قولی روایتوں سے نہیں سیکھی، بلکہ ان روایتوں سے پہلے اور ان روایتوں کے بغیر سیکھی اور ان متواتر عملی روایتوں کے ذریعہ سیکھی، جن کی حیثیت متواتر عملی سنت کی ہے، قولی روایتیں تو بسا اوقات ایک راوی سے ایک دو راویوں تک پہنچیں، مگر نماز ساری امت سے ساری امت تک پہنچی، گویا امت نے نماز راویوں سے نہیں سیکھی بلکہ نمازیوں سے سیکھی جن میں یہ راوی بھی شامل تھے۔ جب ہم نماز کے مختلف اعمال کا جائزہ لیتے ہیں تو مختلف صورتیں سامنے آتی ہیں، بعض اعمال وہ ہیں جن کے سلسلے میں روایتیں بھی آئی ہیں اور عملی تواتر بھی موجود رہا ہے، ساری روایتیں بڑے اعلی درجے کی ہیں اور عملی تواتر تو ہے ہی نہایت اعلی درجے کی دلیل، جیسے تشہد کی مختلف صورتیں۔ بعض اعمال وہ ہیں جن کے سلسلے میں روایتیں نہیں ہیں، یا ہیں تو بہت ہی ضعیف ہیں، البتہ عملی تواتر ہے، جیسے رکوع کے بعد کھڑے ہونے پر ہاتھ کہاں رکھے جائیں؟ اور عورتوں کے سجدے کی شکل کیا ہو؟ بعض اعمال وہ ہیں جن کے سلسلے میں روایتیں ہیں لیکن ان میں ذرا سی کمزوری ہے، یا یہ کہ وہ خود محدثین کے یہاں معروف نہیں ہیں، تاہم عملی تواتر موجود ہے، جیسے حالت قیام میں ہاتھ کہاں رکھے جائیں۔ غرض یہ کہ روایتوں کا درجہ مختلف ہو سکتا ہے، کسی عمل کے سلسلے میں متواتر روایتیں مل جاتی ہیں، اور کسی عمل کے سلسلے میں متواتر روایتیں نہیں ملتی ہیں، کسی عمل کے حق میں صحیح روایتیں ملتی ہیں اور کسی عمل کے سلسلے میں ضعیف روایتیں ہی ملتی ہیں، لیکن ایک حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے وہ یہ کہ عظیم فقہاء نے اپنے زمانے میں امت کو نماز کے مختلف اعمال انجام دیتے ہوئے دیکھا، اور ان میں سے جو طریقہ ان کو زیادہ پسند آیا اس کو اختیار کیا، ان کے زمانے میں امت میں جو طریقے رائج تھے، وہ دراصل عملی تواتر کے ساتھ ان کے زمانے تک پہنچے تھے۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد ہمارا رویہ نماز سے متعلق روایتوں کے بارے میں تبدیل ہونا چاہئے، ہم یہ نہ سمجھیں کہ نماز بس وہ ہے جو روایتوں میں مذکور ہے، بلکہ نماز تو پہلے نمبر پر وہ ہے جو امت نے امت کے تعامل سے سیکھی، یعنی جو کچھ صحیح روایتوں میں ہے وہ تو درست ہے، ساتھ ہی وہ جو روایتوں میں نہیں ہے مگر امت نے امت کے تعامل سے سیکھا ہے وہ بھی درست ہے۔"(۲۲)

سنتوں کے تنوع سے متعلق جب عملی تواتر کی دلیل پر گفتگو ہوتی ہے تو ایک سوال یہ سامنے آتا ہے کہ نماز کے مختلف طریقوں سے متعلق یا نماز کی صورت گری کے سلسلہ میں ائمہ مجتہدین کا کیا رول تھا، انہوں نے اس سلسلے میں از سر نو اجتہاد سے کام لیا جیسا کہ زندگی کے دوسرے مسائل میں انہوں نے اجتہاد کیا یا ان کا کام خالص تدوینی نوعیت کا تھا۔ چونکہ عملی تواتر کی دلیل پر پروفیسر صدیقی کے ہاں بہت واضح نہیں ہے، اس لیے وہ اس قسم کے سوالات سے بھی تعرض نہیں کرتے، البتہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر محی الدین غازی نے بہت ہی زبردست گفتگو کی ہے، لکھتے ہیں:

"ائمہ مجتہدین نے امت کو نماز پڑھنا نہیں سکھائی بلکہ اپنے وقت کی امت سے نماز پڑھنا سیکھی، اس یقین کے ساتھ کہ یہی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ہے، اور اسی طریقے کی تدوین کی، ہر امام نے جب شعور کی عمر کو پہنچ کر آنکھوں سے دیکھا تو اپنے شہر کے لوگوں کو نماز پڑھتے ہوئے پایا، اور اس یقین کے ساتھ نماز پڑھتے ہوئے پایا کہ ان کی نماز بالکل درست ہے اور طریقہ رسول کے عین مطابق ہے۔ کبھی کبھی لوگوں کی گفتگو سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام شافعی کے زمانے میں امت کو نماز پڑھنی نہیں آتی تھی، اس لیے ہر امام نے اپنے پاس موجود دلائل کی روشنی میں نماز کا طریقہ امت کے سامنے پیش کیا۔ یہ تصور درست نہیں ہے۔ اماموں کا زمانہ تو بہت بعد کا ہے، امت تو ان سے پہلے بھی بڑے اطمینان کے ساتھ روزانہ

نماز پڑھتی تھی، اور پوری امت نماز کے مختلف طریقوں کے بارے میں یہ یقین رکھتی تھی کہ یہ سب طریقے درست ہیں، اور سنت رسول کے مطابق ہیں۔ ان کے درمیان نماز کے طریقوں کو لے کر نہ کوئی بے اطمینانی تھی، نہ کوئی آپس میں جھگڑا تھا۔ اس دور کے اماموں اور فقیہوں نے نماز کے بارے میں یہ کام ضرور کیا کہ نماز کے رائج طریقوں کو ریکارڈ کر لیا۔ چونکہ انہوں نے اس فقہ کی تدوین کا بیڑہ اٹھایا تھا جو لوگوں کی پریکٹس میں تو تھی لیکن ابھی اس کی باقاعدہ تدوین کا عمل تشنہ تکمیل تھا، اور یوں نماز کے سارے طریقے بھی تدوین کے عمل میں شامل ہو گئے۔" (۲۳)

اس سلسلے میں دوسرا اہم سوال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ احادیث کی عدم موجودگی میں نماز کا کوئی طریقہ عملی تواتر سے کیسے ثابت ہو سکتا ہے، یا یہ سوال کہ احادیث کے بغیر عملی تواتر کا وجود کیسے قبول کیا جا سکتا ہے۔ اس سوال کا جواب بھی "سنتوں کا تنوع" کتاب میں نہیں ملتا، جبکہ ڈاکٹر محی الدین غازی نے اس سوال پر بھی اچھی گفتگو کی ہے، لکھتے ہیں:

"احادیث کے نہ ہوتے ہوئے بھی عملی تواتر سے نماز کا کوئی طریقہ کیسے ثابت ہوتا ہے اس کی ایک مثال یہ ہے کہ عورتوں کی نماز کیسی ہو؟ یعنی مردوں کی طرح ہو یا ان سے کچھ مختلف ہو۔ رکوع اور سجدہ کے سلسلے میں امت کا عام موقف یہ رہا ہے کہ آدمی اپنے ہاتھوں کو اپنے پہلوؤں سے الگ رکھے، یعنی ہاتھوں اور پسلیوں میں واضح سا فاصلہ رہے، اس کو تجافی کہا جاتا ہے، امام نووی کا کہنا ہے کہ اس عمل کے پسندیدہ ہونے میں کسی بھی عالم کا اختلاف میں نہیں جانتا، اور اس طریقہ میں حکمت یہ ہے کہ یہ نماز کی صورت و ہیئت کے کمال میں اضافہ کرتا ہے۔ امام طحاوی بھی اس بات پر اجماع ذکر کرتے ہیں، متعدد صحابہ سے اس عمل کا مطلوب و مسنون ہونا منقول ہے۔ لیکن یہ سب مردوں کے سلسلے میں ہے۔ عورتوں کے سلسلے میں صورتحال بالکل مختلف ہے، چاروں فقہی مسالک اس پر تقریباً متفق ہیں، احناف مالکیہ شافعیہ حنابلہ سب کے یہاں یہی رائے پائی جاتی ہے، کہ عورت نماز کے دوران اپنے آپ کو سمیٹے، سجدہ میں اپنے پیٹ کو اپنی رانوں سے ملا لے، پیروں کو کھڑا کرنے کے بجائے، زمین پر چت رکھے، بیٹھے تو تربع کی حالت بنا کر بیٹھے۔ خاص بات یہ ہے کہ ان سارے ہی مسالک کا موقف ایک ہے اور دلیل بھی ایک ہے، اور وہ دلیل کوئی روایت نہیں ہے، کیونکہ اس بارے میں جس قدر بھی روایتیں ہیں وہ ضعیف بتائی جاتی ہیں، جس دلیل کو فقہاء ذکر کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس میں عورت کے اعضاء کی پردہ داری زیادہ بہتر طور سے ہوتی ہے، اگر وہ مرد کی طرح رکوع اور سجدہ کرے تو ستر کا پہلو متاثر ہوتا ہے۔ مجھے اس مسئلہ کے بارے میں پڑھتے ہوئے جس چیز نے بہت متاثر کیا وہ یہ کہ اس بات کے حق میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں ہے کہ عورتیں مردوں سے مختلف طریقہ اپنائیں، علامہ البانی نے اس بات کو پورے وثوق کے ساتھ کہا ہے، کہ اس سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بھی وارد ہوا ہے اس میں کچھ بھی صحیح نہیں ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایک بھی صحیح حدیث نہ ہونے کے باوجود چاروں مسلک ایک بات پر متفق ہو گئے، حالانکہ متعدد مسائل میں بہت ساری صحیح حدیثوں کے ہوتے ہوئے ان میں کافی اختلاف ہو رہا ہے۔" (۲۴)

کتاب کے استدلالی پہلو سے متعلق یہ کچھ باتیں تھیں، کچھ باتیں تحقیقی پہلو سے متعلق بھی توجہ طلب ہیں۔ تحقیقی پہلو سے متعلق کچھ اہم چیزیں تو وہ ہیں جن کی جانب جناب مجاہد شبیر فلاحی صاحب نے سہ ماہی تحقیقات اسلامی (جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸ء) میں شائع اپنے تبصرے میں توجہ دلائی ہے (۲۵)۔ اس کے علاوہ بھی متعدد چیزیں ہیں جن کی جانب توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ص ۶۰ پر حافظ ابن حجر کے حوالے سے ایک بات کہی گئی ہے، جبکہ یہ بات حافظ ابن حجر کی نہیں ہے، امام ترمذی کی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں: "حافظ ابن حجر عسقلانی نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے تشہد کو تمام تشہدات میں سب سے صحیح قرار دیا ہے: ان کا بیان ہے کہ تشہد کے باب میں وہ سب سے صحیح حدیث ہے جو روایت کی گئی ہے اور صحابہ کرام اور ان کے بعد کے اکثر اہل علم کا اسی پر عمل ہے، ... وھو اصح حدیث روی فی التشھد والعمل علیہ عند اکثر اھل العلم من الصحابۃ ومن بعدھم"۔

جبکہ سنن ترمذی میں صاف طور پر امام ترمذی کا یہ قول موجود ہے:

"حدیث ابن مسعود قد روی عنہ من غیر وجہ وھو اصح حدیث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی التشھد"، والعمل علیہ عند اکثر اھل العلم من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ومن بعدھم من التابعین، وھو قول سفیان الثوری، وابن المبارک، واحمد، واسحاق۔ (۲۶)

حضرت ابن مسعود کی حدیث مختلف طرق سے روایت کی گئی ہے۔ وہ تشہد کے باب میں سب سے صحیح حدیث ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے بیان کی گئی ہے۔ اسی پر عمل رہا ہے اصحاب علم کے نزدیک، خواہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہوں، یا ان کے تابعین ہوں، سفیان ثوری، ابن مبارک، احمد اور اسحاق کا بھی یہی قول ہے۔

فتح الباری میں بھی صاف طور سے اس قول کی نسبت امام ترمذی کی

طرف کی گئی ہے:

قال الترمذی حدیث بن مسعود روی عنہ من غیر وجہ وھو اصح حدیث روی فی التشہد والعمل علیہ عند اکثر اھل العلم من الصحابۃ ومن بعدھم۔(۲۷)

ترمذی نے کہا ہے، ابن مسعود کی حدیث ایک سے زائد طرق سے آئی ہے، تشہد کے باب میں وہ سب سے صحیح حدیث ہے۔ اسی پر اہل علم کا عمل رہا ہے، چاہے وہ صحابہ میں سے ہوں، یا بعد کے اہل علم ہوں۔

یہ پہلو اس لیے بھی قابل توجہ ہے کہ مصنف نے اس کی بنیاد پر پوری ایک بحث کھڑی کی ہے، اور اسے ابن حجر کا قول مانتے ہوئے کتاب کے کئی مقامات پر اس کو نقل کیا ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ فتح الباری میں گرچہ امام ابن حجر نے یہ قول امام ترمذی کی طرف منسوب کرتے ہوئے درج کیا ہے، تاہم پروفیسر موصوف نے سہواً اسے ابن حجر کا قول سمجھتے ہوئے نقل کر دیا ہے۔

اسی طرح کا ایک سہو تکبیر تحریمہ کے بعد رفع یدین کے مسئلہ سے متعلق بھی ہو گیا ہے، صفحہ ۴۷ پر لکھتے ہیں:

”امام ابوحنیفہؒ وغیرہ تکبیر تحریمہ کے بعد رفع یدین کی احادیث و آثار کو قبول کرنے کے باوجود اس کے قائل ہیں کہ یہ پہلے کی سنت تھی اور بعد میں آپؐ نے رفع یدین ترک کر دیا تھا“۔

راقم کی تحقیق کے مطابق امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف اس رائے کی نسبت کسی بھی طرح درست نہیں ہے، یہ بات احناف کے ہاں متأخرین فقہاء کے ہاں تو ملتی ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ کی طرف نسبت کے ساتھ یہ رائے کہیں نہیں ملتی۔ راقم کا خیال ہے کہ متأخرین فقہاء احناف کی رائے کو پروفیسر موصوف نے امام ابوحنیفہ کی رائے محمول کرتے ہوئے نقل کر دیا ہے، جبکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے بالکل ہی مختلف ہے۔

چیزوں کو نقل کرنے میں یہ بے احتیاطی کتاب میں اور بھی کئی جگہ کھٹکتی ہے، صفحہ ۱۴۲ پر صحابہ کرام کے اپنی خاص سنتوں اور تعلیم نبوی سے شرعی جذباتی لگاؤ اور بیکراں عشق کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن مسعود کے تعلق سے لکھتے ہیں:

”حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے رسول اکرمؐ کی خاص تعلیم اور آپؐ کے دہن مبارک سے سن اور یاد کر کے صرف ستر سورتیں ہی اپنے مصحف میں لکھی تھیں، حالانکہ وہ خوب جانتے تھے کہ کل ایک سو چودہ سورتیں ہیں“۔

یہ بات کسی بھی طور پر ناقابل تسلیم ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنی خاص سنت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل سنت سے زیادہ عزیز ہو جائے گی، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی شخصیت اور عظمت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس پر غور کیا جائے تو حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے بارے میں یہ بات کہنا کسی بھی طرح سے درست نہیں قرار دیا جا سکتا۔ حضرات صحابہ کرامؓ کے حوالہ سے اس قسم کی باتیں مختلف کتابوں میں نقل کی جاتی ہیں، حالانکہ احتیاط کا تقاضا ہے کہ اس سلسلے میں حد درجہ احتیاط، سنجیدگی اور ذمہ داری کا رویہ اختیار کیا جائے۔

کہیں کہیں مسائل کی نوعیت کے تعین میں بھی یہ سہو صاف نظر آتا ہے، صفحہ ۴۳ پر سورہ فاتحہ کی قرأت سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”سورہ فاتحہ کی قرأت کا مسئلہ سنت اور اس کے تنوع سے زیادہ فرض و واجب ہونے سے ہے۔“

حالانکہ سورہ فاتحہ کی قرأت سنت ہو یا واجب، یا بعض احوال میں کچھ کے نزدیک اس کا نہیں پڑھنا سنت ہو، یہ سب کچھ سنت ہی کا مسئلہ ہے اور سنتوں کے تنوع کے تحت ہی اس کا صحیح حل مل سکتا ہے، بشرطیکہ عملی تواتر کی دلیل سامنے رہے۔ فعل اور ترک فعل دونوں کا تعلق سنت کے تنوع سے ہے، البتہ فعل کا حکم تکلیفی کیا ہے اور ترک کا حکم تکلیفی کیا ہے اس طرح کے فقہی احکام کا تعلق فقہاء کے اجتہادی اصولوں اور ان کی تطبیق سے ہے۔

صفحہ ۷۸۔۷۹ پر موکدہ سنتوں کا بیان ہے، اور یہاں صاف طور سے سنتوں کے تنوع کا انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ان موکدہ سنتوں میں ظاہر ہے کہ تنوع کا سوال نہیں پیدا ہوتا کہ بارہ رکعتوں کی تعیین رسول اکرمؐ نے کی ہے۔ مسلم کی حدیث عائشہؓ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ بنفس نفیس بالعموم بارہ رکعت سنتیں گھر میں پڑھا کرتے تھے۔ البتہ بخاری مسلم کی حدیثِ ابن عمر سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے رسول اکرم ﷺ کے ساتھ ظہر سے پہلے دو رکعتیں پڑھیں: ”صلیت مع رسول اللہ ﷺ رکعتین قبل الظھر“۔ اگرچہ یہ متفق علیہ حدیث ہے اور سند و روایت کے لحاظ سے قوی تر تاہم وہ ایک عارضی اجازت دیتی ہے، عام اصول سنت نہیں بیان کرتی۔ اس کا مفہوم و مطلب یہ ہے کہ ظہر کے فرض سے پہلے کی چار سنتیں کسی وجہ سے نہ پڑھ سکے تو دو سنتیں ہی ادا کر لے۔ یہ سنت نبوی ہے محض جائز نہیں جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے، البتہ خاص احوال کی سنت ہے۔ اس کا ذکر اصل مستقل سنت اور عارضی سنت کے ذیل میں آتا ہے اور اس ضمن میں بھی کہ سنت موکدہ کبھی کبھی چھوڑ بھی دیتے تھے“۔

یہ پوری بات ہی محل نظر ہے، کیونکہ موکدہ سنتوں میں بھی صاف طور پر تنوع موجود ہے، اسی لیے شوافع اور حنابلہ کے یہاں ظہر سے پہلے دو رکعتیں، احناف کے یہاں چار رکعتیں اور مالکیہ کے یہاں عدد معین نہیں ہے۔

عن عبد اللہ بن عمر: أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان

یصلی قبل الظهر رکعتین، وبعدها رکعتین، وبعد المغرب رکعتین فی بیته، وبعد العشاء رکعتین، وکان لا یصلی بعد الجمعة حتی ینصرف، فیصلی رکعتین۔(۲۸)

(حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے پہلے دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے، اور دو رکعتیں ظہر کے بعد پڑھا کرتے تھے، اور مغرب کے بعد دو رکعتیں اپنے گھر پر پڑھتے تھے، اور عشاء کے بعد دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے، اور نماز جمعہ کے بعد کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے، یہاں تک کہ گھر واپس آجاتے تھے اور پھر دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔)

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما، قال: حفظت من النبی صلی اللہ علیہ وسلم عشر رکعات رکعتین قبل الظهر، ورکعتین بعدها، ورکعتین بعد المغرب فی بیته، ورکعتین بعد العشاء فی بیته، ورکعتین قبل صلاة الصبح۔(۲۹)

(حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہتے ہیں: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دس رکعتیں محفوظ کی ہیں، دو رکعتیں ظہر سے پہلے اور دو رکعتیں ظہر کے بعد، اور دو رکعتیں مغرب کے بعد اور دو رکعتیں عشاء کے بعد گھر میں، اور دو رکعتیں نماز فجر سے پہلے۔)

حضرت عبداللہ ابن عمر کا اپنے موقف پر اعتماد قابل لحاظ ہے۔ یہ عارضی سنت کا بیان نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ تو ایک معمول ہے، جبکہ دوسرا معمول حضرت عائشہ نے ذکر کیا ہے، اور دونوں ہی امت میں بطور سنت متواترہ رائج ہیں۔

عن عبد اللہ بن شقیق، قال: سألت عائشة عن صلاة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، عن تطوعه؟ فقالت: کان یصلی فی بیتی قبل الظهر أربعا، ثم یخرج فیصلی بالناس، ثم یدخل فیصلی رکعتین، وکان یصلی بالناس المغرب، ثم یدخل فیصلی رکعتین، ویصلی بالناس العشاء، ویدخل بیتی فیصلی رکعتین، وکان یصلی من اللیل تسع رکعات فیهن الوتر، وکان یصلی لیلا طویلا قائما، ولیلا طویلا قاعدا، وکان اذا قرأ وهو قائم رکع وسجد وهو قائم، واذا قرأ قاعدا رکع وسجد وهو قاعد، وکان اذا طلع الفجر صلی رکعتین۔(۳۰)

(حضرت عبداللہ بن شقیق سے روایت ہے، کہتے ہیں: میں نے حضرت عائشہؓ سے رسول پاکؐ کی نفل نمازوں کے بارے میں دریافت کیا؟ تو انہوں نے فرمایا: آپ میرے گھر میں ظہر سے قبل چار رکعتیں پڑھتے، پھر باہر جاکر لوگوں کی امامت فرماتے، پھر اندر آکر دو رکعتیں پڑھتے۔ مغرب میں لوگوں کی امامت کرنے کے بعد گھر آجاتے اور دو رکعتیں پڑھتے۔ عشاء میں لوگوں کی امامت کرتے، پھر اندر آکر دو رکعتیں ادا کرتے۔ اور آپ رات میں نو رکعتیں پڑھتے جن میں وتر بھی شامل ہوتی، آپ رات میں لمبی لمبی نمازیں پڑھتے تھے کھڑے ہو کر۔ اور لمبی لمبی نمازیں پڑھتے تھے بیٹھ کر۔ کھڑے ہو کر جب قرآن پڑھتے تو رکوع و سجدہ بھی کھڑے ہو کر کرتے، اور بیٹھ کر اگر قرآن پڑھتے، تو رکوع و سجدہ بھی بیٹھ کر کرتے۔ اور جب فجر طلوع ہو جاتی تو دو رکعتیں پڑھ لیتے۔)

سنن موکدہ کے تعلق سے پوری گفتگو میں مصنف موصوف کا جھکاؤ ایک خاص مسلک کی طرف نظر آتا ہے، جبکہ عملی تواتر کی روشن دلیل یہاں صاف طور سے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

زبان و بیان کے حوالہ سے بھی کچھ باتیں ہیں، کچھ باتیں تو ایسی ہیں جو کتابت کی غلطی پر محمول کی جا سکتی ہیں، تاہم کچھ باتیں ایسی ہیں جو دعویٰ کے انداز میں کہی گئی ہیں اور ذہن کسی بھی طور پر انہیں قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا، صفحہ ۲۳ پر اختلاف کے اردو اور عربی مفہوم پر گفتگو کچھ اس طرح کرتے ہیں:

”وہ دراصل اردو کا اختلاف نہیں جو تضاد و تصادم کے معنی رکھتا ہے اور ایک دوسرے کا مد مقابل، حریف اور مخالف بن کر سامنے آتا ہے۔ وہ عربی کا اختلاف ہے جس کے معنی تنوع، رنگا رنگی اور گوناگونی اور بوقلمونی ہیں، یعنی وہ رنگا رنگ سنتیں ہیں اور سب صحیح ہیں“۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ دونوں زبانوں میں اختلاف کا لفظ دونوں معنوں میں مستعمل ہے۔ شاعر کہتا ہے:

اختلاف رنگ ہے اعجاز قدرت کی دلیل
پھول کھل کر کیوں نہ دعوائے خم عیسی کریں

تجزیاتی مطالعہ پر مبنی کچھ معروضات تھیں، جو اس مختصر سے مقالہ میں پیش کی گئیں۔ آخر میں اس بات کا ایک بار پھر اعتراف ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ”سنتوں کا تنوع“ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی صاحب کی ایک گراں قدر تصنیف ہے، یہ کتاب صحیح معنوں میں غور و فکر کی ایک وسیع دنیا کی سیر کرانے والی کتاب ہے۔ امید کہ اہل علم اس پر توجہ فرمائیں گے۔

حوالہ جات

(۱) امت کے اختلافات اور امت کو درپیش مسائل پر مولانا مودودی نے کافی کچھ قلم بند کیا ہے، اس سلسلے میں مولانا مودودی کے افکار کا تجزیاتی مطالعہ آج بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہوگا۔

(۲) ”نماز اتحاد امت کی بنیاد“، اس موضوع پر ڈاکٹر محی الدین غازی کا ایک

بہت ہی وقیع اور فکر انگیز کتابچہ منشورات لاہور نے ۲۰۱۷ء میں شائع کیا تھا، یہ کتابچہ در حقیقت موصوف کی معرکہ آراء تصنیف ”نماز کے اختلافات اور ان کا آسان حل“ (شائع کردہ: ہدایت پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، نئی دہلی ۲۰۱۵ء) کی تلخیص ہے۔

(۳) رسائل و مسائل حصہ دوم ص ۳۹۰

(۴) رسائل و مسائل حصہ اول، ص ۱۶۵، ۱۶۴

(۵) رسائل و مسائل، حصہ اول، ص ۱۶۳

(۶) سنتوں کا تنوع، پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی، صفحہ ۸

(۷) یہ بات بھی محل نظر ہے کہ پوری کتاب میں سید مودودی علیہ الرحمہ کا تذکرہ ایک بار بھی نہیں کیا گیا، جبکہ سید مودودی کا موقف اس سلسلے میں زیادہ واضح اور دو ٹوک ہے۔

(۸) ایضاً: ص ۸۔۹

(۹) ایضاً: ص ۹

(۱۰) ایضاً: ص ۹

(۱۱) ایضاً: ص ۱۰

(۱۲) ایضاً: ص ۳۱

(۱۳) ایضاً: ص ۱۷۷

(۱۴) ایضاً: ص ۱۸۱

(۱۵) ایضاً: ص ۱۸۱

(۱۶) ایضاً: ص ۱۸۱۔ ۱۸۲

(۱۷) ایضاً: ص ۲۴

(۱۸) ایضاً: ص ۳۹۔ ۴۰

(۱۹) ایضاً: ص ۴۰

(۲۰) ایضاً: ص ۴۰

(۲۱) ایضاً: ص ۲۰

(۲۲) نماز کے اختلافات اور ان آسان حل، محی الدین غازی، ص ۳۲۔ ۳۳

(۲۳) ایضاً، ص ۳۸

(۲۴) ایضاً، ص ۳۵۔ ۳۶

(۲۵) مجاہد شبیر فلاحی نے سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، ماہ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸ء میں درج ذیل اہم امور کی طرف توجہ دلائی ہے:

(الف) صفحہ ۱۸، ۱۹ کی بحث میں قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ کے سلسلے میں خلط مبحث۔

(ب) صفحہ ۳۷ پر نماز کے اذکار کے سلسلہ میں کمزور رائے پر اعتماد۔

(ج) آنحضرتؐ کے حج کی تعداد کے سلسلہ میں موقف۔

(د) صفحہ ۱۱۴ پر قربانی کے گوشت کے سلسلہ میں مصنف کی گفتگو۔

(ہ) صفحہ ۱۱۶ پر سونے کی انگوٹھی کے استعمال سے متعلق گفتگو۔

(۲۶) سنن الترمذی، ت: شاکر: ۲، ۸۲

(۲۷) فتح الباری لابن حجر: ۲، ۳۱۵

(۲۸) صحیح البخاری: ۲، ۱۳

(۲۹) صحیح البخاری: ۲، ۵۸

(۳۰) صحیح مسلم: ۱، ۵۰۴

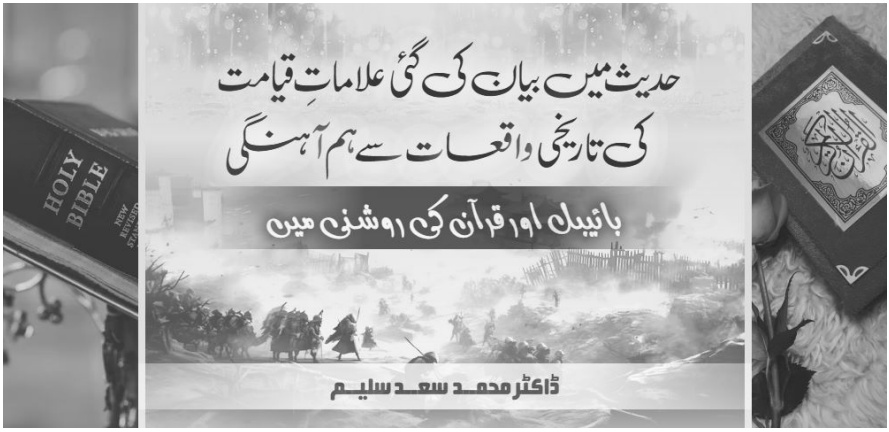

یاجوج اور ماجوج

یاجوج اور ماجوج بائبل، قرآن، اور احادیث میں مذکور قومیں ہیں۔ قرآن میں یاجوج اور ماجوج کی رہائی کو قیامت کی نشانی کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

یاجوج اور ماجوج کی تاریخ

پرانے عہد نامے میں یاجوج اور ماجوج کا ذکر

کتاب پیدائش[114] میں، ماجوج کو حضرت نوح (علیہ السلام) کے بیٹے یافث کی اولاد میں سے بیان کیا گیا ہے۔ یافث کی نسل کو روایتی طور پر "سفید قوموں" سے منسوب کیا جاتا ہے، جو مشرق وسطیٰ کے شمالی علاقوں، جیسے اناطولیہ، بحیرہ اسود اور بحیرہ کیسپین کے قریب کے خطے، وسطی ایشیا اور یورپ تک پھیلے ہوئے تھے۔

حضرت حزقی ایل (علیہ السلام) نے، جو اللہ کے نبی تھے، بابل میں جلاوطن بنی اسرائیلی کو امید کا پیغام دیا۔ یہ پیغام 586 قبل مسیح میں پہلے یہودی معبد کی تباہی کے بعد دیا گیا تھا۔ انہوں نے پیشگوئی کی کہ اللہ اسرائیلیوں کو مستقبل میں ایک کثیر النسلی فوج پر فیصلہ کن فتح عطا کرے گا، جس کی قیادت ماجوج کی زمین سے آنے والے یاجوج نامی شخصیت کرے گا[115]۔ یاجوج، "مسک اور توبال کا سردار شہزادہ"، ایک اتحاد کی قیادت کرتا ہے جو "دور شمال" کے علاقوں سے آتا ہے۔[116]، [117] تاریخی اور جغرافیائی روایات ان علاقوں کو اکثر بحیرہ اسود کے قریب علاقوں سے جوڑتی ہیں۔

حضرت حزقی ایل (علیہ السلام) کی پیشگوئی اس وقت کے واقعات سے مطابقت رکھتی ہے، جب یونانیوں کے سلوقی بادشاہ انطیوکس چہارم نے 167 قبل مسیح میں دوسرے یہودی معبد کی بے حرمتی کی[118]۔ یہ واقعہ یہودیوں کی مکابی بغاوت

کا سبب بنا، جس کے نتیجے میں معبد کی بحالی ہوئی۔ یہ واقعات یہودیوں کے لیے عید ہنوکا کے تہوار کے طور پر یاد کیے جاتے ہیں۔ اسرائیلیوں نے سلوقی افواج سے جنگی مال اور اہم قلعے و شہر واپس حاصل کیے، جو حضرت حزقی ایل (علیہ السلام) کے خواب میں اسرائیل کے لیے الٰہی مداخلت اور فتح کی عکاسی کرتا ہے۔

تاریخی ریکارڈز سے پتہ چلتا ہے کہ وسطی ایشیا اور بحیرہ اسود کے علاقوں سے تعلق رکھنے والے قبائل کو ان کی عمدہ گھڑسوار فوجی صلاحیتوں کی وجہ سے مختلف سلطنتوں نے کرائے کے سپاہیوں کے طور پر بھرتی کیا۔ یونانیوں کی سلوقی سلطنت، جو اپنے علاقوں، خاص طور پر اناطولیہ اور پڑوسی شمالی علاقوں سے فوجیوں کو بھرتی کرتی تھی، اسی طریقہ کار پر عمل کیا۔ یاجوج کی قیادت میں کثیر النسلی فوج کو سلوقی سلطنت کے تحت یہودیہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یاجوج کا کردار حضرت حزقی ایل (علیہ السلام) کے خواب میں وسطی ایشیا اور ایران کے جنگجو گروہوں کے عروج سے مطابقت رکھتا ہے، جو تیسری صدی قبل مسیح کے وسط سے سلوقی افواج کے اتحادی یا کرائے کے سپاہی بنے۔ یہ علاقے سلوقی افواج کی عسکری بنیاد بنے اور ان کی مہمات اور علاقائی غلبے میں نمایاں کردار ادا کیا۔[119]

قرآن میں یاجوج اور ماجوج کا ذکر

سورہ کہف[120] میں قرآن یاجوج اور ماجوج نامی ایک فساد پھیلانے والے گروہ کا ذکر کرتا ہے۔ ان کے خلاف ذوالقرنین ایک دیوار تعمیر کرتے ہے تاکہ ان کے فساد کو روکا جا سکے۔ ذوالقرنین کو ایران کے ہخامنشی سلطنت کے رہنما، کوروش اعظم کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے، کیونکہ حضرت دانیال (علیہ السلام) کے خواب میں ہخامنشی سلطنت کو دو سینگوں والے مینڈھے کے طور پر پیش کیا گیا ہے[121] — یہ دو سینگ اس سلطنت میں فارسی اور مادی قوموں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ تاریخ میں باقی دیواروں کی طرح یہ دیوار بھی ٹوٹ چکی ہے اور غالباً قفقاز کے پہاڑی سلسلے میں تعمیر کی گئی تھی[122] — وہی خطہ جو وسطی ایشیا کے شمالی قبائل اور مشرق وسطیٰ کی مہذب دنیا کے درمیان ایک قدرتی رکاوٹ کے طور پر قائم رہا۔

ذوالقرنین کا واقعہ اسرائیلی روایات میں تفصیل سے بیان ہوا ہے، تاہم ان روایات میں ذوالقرنین کو اسکندر اعظم کے ساتھ منسلک کیا گیا ہے[123]۔ مؤرخین نے اس نسبت پر اعتراض کیا ہے، کیونکہ قفقاز میں تعمیر کی گئی دیواریں جن کا ذکر اسرائیلی روایات میں ملتا ہے، درحقیقت اسکندر اعظم سے پہلے ایران کی ہخامنشی سلطنت کے دور میں تعمیر ہوئی تھیں۔

پرانے عہد نامے میں "ماجوج کی زمین سے یاجوج" کا تصور، نئے عہد نامے اور قرآن میں "یاجوج اور ماجوج" کے اجتماعی ذکر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ وقت کے ساتھ، یاجوج کا انفرادی کردار یا لقب ماجوج کی وسیع تر آبادی کے ساتھ جڑ گیا، اور یوں "یاجوج و ماجوج" کا اطلاق ان شمال کی قوموں پر ہونے لگا جو زمین میں فساد اور جارحیت پھیلاتی تھیں۔

تاریخی ریکارڈ میں یاجوج اور ماجوج کا ذکر

پہلی صدی عیسوی کے یہودی مؤرخ جوزیفس نے ماجوج کو سکوتی قبائل کے ساتھ منسلک کیا، جو ایک خانہ بدوش گروہ تھا اور بحیرہ اسود کے شمالی علاقوں میں آباد تھا۔[124]

یاجوج اور ماجوج کا خروج—یورپی نوآبادیاتی تسلط

نیا عہد نامہ میں یاجوج اور ماجوج کا خروج

کتاب مکاشفہ[125] میں یہ ذکر ملتا ہے کہ "صادق" اور "امین" کے ایک ہزار سال بعد، یاجوج و ماجوج زمین کے چاروں کونوں سے نکل کر، شیطان کے دھوکے میں آکر جنگ کے لیے جمع ہوتے ہیں، اور زمین پر پھیلتے ہوئے 'مقدسوں کی لشکر گاہ' اور 'عزیز شہر' کا محاصرہ کر لیتے ہیں۔

کتاب مکاشفہ[126] میں درج "صادق" اور "امین" کے القابات حضرت محمد ﷺ کے عام طور پر پہچانے جانے والے نام ہیں، جو ان کے نبوت سے بھی پہلے کے القابات تھے۔ اس لحاظ سے "ہزار سال" کے بعد کا دور سترہویں صدی عیسوی کے زمانے سے مطابقت رکھتا ہے —وہی دور جب یورپی اقوام (خصوصاً شمالی اور مغربی یورپ) "زمین کے چار کونوں" یعنی امریکہ، افریقہ، چین، ہندوستان اور انڈونیشیا تک پھیل چکی تھیں۔ شیطان کا یاجوج و ماجوج کو سترہویں صدی میں دھوکہ دینا اس عملی اور فکری تبدیلی کی علامت ہے، جس کے نتیجے میں یہی یورپی اقوام نئے علاقوں کی دریافت، تجارتی راستوں اور ساحلی تجارتی چوکیوں تک محدود رہنے کے بجائے باقاعدہ سامراجی حکمرانوں میں تبدیل ہوگئیں، جب یورپی اقوام کا عہدِ دریافت اختتام پذیر ہوا اور عہدِ سلطنت کا آغاز ہوا۔ شیطان کا دھوکہ ان کے درمیان لالچ، غرور، اور طاقت کے حصول کی دوڑ کو ظاہر کرتا ہے۔

کتاب مکاشفہ میں "مقدسوں کی لشکر گاہ" مدینہ منورہ کی طرف اشارہ کرتی ہے، جبکہ "عزیز شہر" مکہ مکرمہ کی علامت ہے۔[127] تاریخی طور پر دیکھا جائے تو پہلی جنگِ عظیم کے بعد ان دونوں مقدس شہروں کے گرد واقع خطے یورپی استعمار کے زیر اثر آ گئے:

- برطانوی قبضہ: اردن، عراق، خلیج کے ساحلی علاقے (یو اے ای)
- برطانوی مینڈیٹ: فلسطین
- برطانوی اثر: عدن (یمن)
- فرانسیسی کنٹرول: شمالی افریقہ، شام، لبنان

شمالی اور مغربی یورپ کی نسب

شمالی اور مغربی یورپ کا نسب یامنایا ثقافت (3300–2500 قبل مسیح) سے جڑا ہے، جو بحیرہ خزر کے قریب میدانوں سے ابھری اور ممکنہ طور پر حضرت نوح (علیہ السلام) کے بیٹے یافث کی اولاد سے تھی۔ یہ ثقافت انڈو-یورپی زبان بولنے والے گروہوں کی بنیاد بنی، جنہوں نے یورپ، وسطی ایشیا، اور اناطولیہ میں اپنے جینیاتی اور ثقافتی اثرات پھیلائے۔

ان انڈو-یورپی زبان بولنے والے گروہوں میں سے، جرمن قبائل نے خاص طور پر نقل مکانی کے دور (تقریباً 300–800 عیسوی) کے دوران، یورپ کے ثقافتی، سیاسی، اور نسلی منظرنامے کو تشکیل دینے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ سکوتی قوم سے تعلق رکھنے والے کچھ حصے، جیسے آلان اور سرمتی باشندے بھی جرمن قبائل کے ساتھ شامل ہوگئے۔[128] نمایاں جرمن قبائل کا درج ذیل میں ذکر کیا گیا ہے:

- **سیکسن، اینگل، فرینک:** ان قبائل نے برطانیہ، فرانس، اور جرمنی کی ثقافت اور سیاست پر گہرا اثر ڈالا، خاص طور پر مغربی رومی سلطنت کے زوال کے بعد۔
- **اوستروگوتھ:** اٹلی میں سلطنت قائم کی، لیکن بازنطینی سلطنت کے ہاتھوں گوتھک جنگوں میں شکست کھائی۔
- **وزیگوتھ:** روم پر 410 عیسوی میں حملہ کیا اور آئبیریا میں سلطنت قائم کی، جس نے ہسپانوی ثقافت پر دیرپا اثر ڈالا۔
- **وانڈلز:** بحیرہ روم کے راستے شمالی افریقہ ہجرت کی اور قرطاج میں سلطنت قائم کی لیکن فرانس اور آئبیریا میں بھی اثرات چھوڑے۔
- **وائکنگ:** اسکینڈے نیویا سے نکل کر برطانیہ، مشرقی یورپ، اور نارمنز کی تشکیل میں کردار ادا کیا۔

ان جرمن قبائل نے یورپی ثقافت، سیاست اور تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے، جنہوں نے جدید یورپی شناخت کی بنیاد رکھی اور برطانیہ، فرانس، اسپین، جرمنی اور اسکینڈے نیویا جیسے ممالک کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کیا۔ لہٰذا شمالی اور مغربی یورپ کے جرمن قبائل کو یاجوج وماجوج کی اولاد سے جوڑنا معقول اور قابل قبول معلوم ہوتا ہے۔

قرآن میں یاجوج اور ماجوج کا خروج

سورہ الانبیا[129] میں یاجوج وماجوج کے قیامت سے قبل خروج کا ذکر ہے۔

شمالی اور مغربی اقوام کا یورپ سے نکلنا — یعنی ان کا خروج — مختلف موجوں میں وقوع پذیر ہوا۔ ڈاکٹرین آف ڈسکوری اور پوپ کے 1493 میں جاری کردہ "انٹر کیٹرا"[130] جیسے احکامات نے ہسپانوی اور پرتگالی توسیع کو جھوٹی خدائی توثیق دی، جس کے بعد واسکوڈی گاما 1497 میں ہندوستان کے لیے روانہ ہوا۔ نیچے اہم یورپی نوآبادیاتی طاقتوں اور ان

کے زیر اثر علاقوں کی فہرست پیش کی گئی ہے، جو شمالی اور مغربی یورپ سے منسلک ہیں۔ یہ فہرست ان اقوام کے عالمی غلبے اور دنیا بھر میں ان کی نوآبادیاتی وسعت کو واضح کرتی ہے۔

- **پرتگال:** افریقہ، ایشیا، برازیل
- **اسپین:** امریکہ، فلپائن
- **نیدرلینڈز:** انڈونیشیا، کیریبین
- **فرانس:** امریکہ، افریقہ، ایشیا
- **برطانیہ:** دنیا بھر میں (امریکہ، ہندوستان، افریقہ، ایشیا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ)
- **ڈنمارک-ناروے:** گرین لینڈ، کیریبین، ہندوستان
- **سویڈن:** شمالی امریکہ، کیریبین
- **بیلجیم:** کانگو، روانڈا، برونڈی
- **اٹلی:** لیبیا، ایتھوپیا، صومالیہ
- **جرمنی:** افریقہ، بحر الکاہل

حدیث میں یاجوج اور ماجوج کا خروج

قرآن میں ذوالقرنین کے واقعے کو ایک حقیقی واقعے کے طور پر بیان کیا گیا ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے یاجوج اور ماجوج کی رہائی کو علامتی طور پر اسی واقعے سے بیان کیا۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے دیوار میں سوراخ کے بڑھنے کو ان کے قریب الوقوع خروج کی نشانی قرار دیا[131]۔

یاجوج اور ماجوج کا آپس میں تصادم—دوسری جنگ عظیم میں یورپی اقوام کا ٹکراؤ

بائیبل، قرآن اور احادیث میں یاجوج و ماجوج کے قیامت سے پہلے آخری بڑے معرکے کو بیان کیا گیا ہے۔ ان واقعات کی تاریخی مطابقت دوسری جنگِ عظیم کے ان مناظر سے ملتی ہے جب یورپی اقوام ہر سمت سے حملہ آور ہو کر ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔

نیا عہد نامہ میں یاجوج اور ماجوج کا آخری معرکہ

کتاب مکاشفہ میں شیطان یاجوج و ماجوج کو جنگ کے لیے جمع کرتا ہے۔ پھر آسمان سے ایک آگ نازل کی جاتی ہے جو انہیں کھا جاتی ہے—جو اُن کی مکمل ہلاکت کی ایک طاقتور علامت ہے۔[132] یہ علامتی آگ یاجوج و ماجوج کے عظیم معرکے، یعنی دوسری عالمی جنگ، کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس آگ میں ان کا جل کر ختم ہونا نہ صرف نازی جرمنی کی فیصلہ کن شکست کو ظاہر کرتا ہے بلکہ جنگ کے بعد نوآبادیاتی نظام کے زوال کی علامت بھی بنتا ہے۔

قرآن میں یاجوج اور ماجوج کا آپس میں تصادم

سورہ کہف[133] میں اللہ تعالیٰ ایک ایسے دن کا ذکر فرماتے ہیں جب یاجوج اور ماجوج "موجوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہوں گے"، اور صور پھونک دیا جائے گا۔

قرآن ہمیشہ وقت کو سیاق و سباق کے مطابق بیان کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، سورہ الاعراف[134] میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آسمان اور زمین چھ دنوں میں پیدا کیے گئے، جہاں "دن" سے مراد ایک مکمل دور یا زمانہ ہے۔ اسی اصول کے تحت، یاجوج اور ماجوج کے تصادم کا "دن" عالمی واقعات کے آخری دور کو ظاہر کرتا ہے۔

سورہ انبیاء[135] میں اسی تصادم کے پہلے مرحلے کو یاجوج اور ماجوج کے ہر بلند مقام سے حملہ آور ہونے سے ذکر کیا گیا ہے، جس کے بعد "وعدۂ حق" یعنی قیامت کے قریب آنے کا بیان ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی طاقتور فوج بلندی سے تیزی کے ساتھ دشمن پر حملہ آور ہو، جو ان کی جارحیت، برق رفتاری اور ناقابلِ مزاحمت عسکری قوت کی علامت ہے۔

سورہ کہف کا بیان دوسری جنگ عظیم کے مجموعی منظرنامے سے مشابہ ہے، جب یورپی اقوام — جو یاجوج و ماجوج کی نمائندہ ہیں — سمندر کی لہروں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ جبکہ سورہ انبیاء کا ذکر جنگ کے آغاز میں نازی جرمنی کے تیز رفتار حملوں کی طرف اشارہ کرتا ہے، جسے احادیث میں زیادہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

احادیث اس بات کو اجاگر کرتی ہیں کہ اس تصادم اور صور پھونکنے کے درمیان ایک مختصر خوشحالی کا دور ہوگا۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہم اس درمیانی دور میں ہیں۔

احادیث میں یاجوج اور ماجوج کے واقعات

احادیث میں یاجوج اور ماجوج سے متعلق واقعات دوسری جنگ عظیم سے مطابقت رکھتے ہیں:

یاجوج اور ماجوج کا ہر بلندی سے حملہ آور ہونا—نازی جرمنی کا حملہ آور ہونا

حدیث میں یاجوج و ماجوج کی آخری عظیم جنگ کے آغاز کو سورۃ الانبیاء کی قرآنی تعبیر "ہر بلندی سے حملہ آور ہوں گے" کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔

تاہم، جہاں قرآن مجید میں لفظ "فُتِحَتْ" (یعنی "وہ کھول دیے جائیں گے") استعمال ہوا ہے،[136] وہاں حدیث میں اس کی جگہ "یَبْعَثُ اللہ" (یعنی "اللہ انہیں بھیجے گا") استعمال کیا گیا ہے۔[137] یہ تبدیلی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اگرچہ یاجوج و ماجوج کا ابتدائی ظہور (مثلاً نوآبادیاتی دور میں) پہلے ہی ہو چکا تھا، لیکن اللہ نے انہیں آخری اور فیصلہ کن جنگ کے لیے بھیجا۔

اس تناظر میں، یہ بیان یاجوج وماجوج کے ہی ایک حصے، یعنی نازی جرمنی، کی دوسری جنگ عظیم کے آغاز میں تیز رفتار، جارحانہ اور وسیع پیمانے پر کی گئی علاقائی توسیع کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ نازی فوجی قوت اور ان کی برق رفتار حربی حکمت عملیوں نے ابتدائی مراحل میں یورپ کے مختلف حصوں میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ فتوحات حاصل کیں۔ یہ بالکل ویسے ہی تھا جیسے کوئی حملہ آور بلند مقام سے اچانک اور تیز رفتاری کے ساتھ نیچے اتر کر مخالفین کو تہس نہس کر دے۔

یاجوج اور ماجوج کا طبریہ کی جھیل کا پانی پینا—نازی جرمنی کا دوسری عیسائی اقوام کے وسائل کا استحصال کرنا

حدیث[138] میں یاجوج اور ماجوج کا طبریہ کے جھیل کا پانی پینے کا ذکر ہے۔

طبریہ کی جھیل، جسے بحیرہ گلیل بھی کہا جاتا ہے، رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں شام کے علاقے میں واقع ایک اہم میٹھے پانی کا ذخیرہ تھی، جس سے عرب بخوبی واقف تھے۔ حدیث میں یاجوج وماجوج کا اس جھیل کا پانی پی جانا دراصل اس امر کی علامت ہے کہ نازیوں نے مقبوضہ علاقوں میں موجود قدرتی وسائل — جیسے تیل، خوراک، اور صنعتی ساز وسامان — کو بے دردی سے استعمال کیا۔ ان وسائل کی شدید طلب نے نہ صرف مقبوضہ علاقوں کو خالی کر دیا بلکہ جنگ کے طول پکڑنے کے ساتھ ساتھ خود جرمنی کی معیشت اور جنگی طاقت بھی شدید دباؤ کا شکار ہو گئی۔

یاجوج اور ماجوج کا بیت المقدس پہنچنا اور آسمان کی طرف تیر چلانا—نازیوں کا یہودیت اور عیسائیت پر حملہ

حدیث[139] میں یاجوج وماجوج کے بیت المقدس کے قریب پہنچنے کا ذکر ہے، جب وہ کہیں گے: "ہم نے زمین والوں کو قتل کر دیا، اب آسمان والوں کو ماریں گے۔" وہ تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے، جو خون میں لت پت واپس آئیں گے۔

دوسری جنگ عظیم کے آغاز میں نازی جرمنی کی غیر متوقع کامیابیاں اس کے حکمرانوں کے تکبر میں اضافے کا باعث بنیں۔ آسمان سے "خون آلود تیروں" کا آنا جرمنی کے مذہب پر طاقت کے ذریعے حملے کی علامت ہے۔ بیت المقدس، جو دورِ نبوی ﷺ میں یہود و نصاریٰ کا مرکز و مسکن تھا، نازیوں نے انہی دونوں مذاہب کو بالخصوص نشانہ بنایا، مثلاً:

- پادریوں اور علماء کو گرفتار یا قتل کیا گیا
- یہودی عبادت گاہیں تباہ کی گئیں
- ہولوکاسٹ میں لاکھوں یہودی قتل کیے گئے
- عیسائی یہوواہ کے گواہوں کو قید یا قتل کیا گیا
- گرجا گھروں کو بند یا حکومتی کنٹرول میں لیا گیا

- نازی مخالف مسیحیوں کو قتل کیا گیا

علاوہ ازیں، نازی قیادت، خاص طور پر ہینرک ہیملر، نے ہٹلر کو مسیحائی شخصیت کے طور پر پیش کیا اور جرمن نسلی برتری و صوفیانہ عقائد پر مبنی ایک نیا نظریاتی مذہب بنایا۔ نازیوں نے نیٹشے کے "خدا مر چکا ہے" کے فلسفے کو فروغ دیا اور روایتی مذاہب کے خاتمے کے ذریعے اپنی نظریاتی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی، جو ان کی طاقت اور اعتماد کے بڑھنے کی علامت تھی۔

یاجوج اور ماجوج کی موت—نازی جرمنی کی شکست

حدیث[140] میں اللہ کا کیڑے بھیجنے کا ذکر ہے جو یاجوج اور ماجوج کی گردنوں پر حملہ کریں گے اور وہ سب ایک ہی جان کے مرنے کی طرح مر جائیں گے۔

یہ تشبیہ نازی جرمنی کے زوال کو بیان کرتی ہے۔ یہاں "گردنوں میں کیڑے پڑنے" کی تعبیر اُس اچانک خودکشی کی علامت ہے جو ہٹلر نے اپریل 1945ء میں کی — جیسے یاجوج و ماجوج کی گردنوں پر کیڑوں کا حملہ ہو، جس نے ان کے اقتدار و اختیار کی رگ کاٹ کر رکھ دی ہو۔ ہٹلر کی موت کے فوراً بعد نازی حکومت نے چند ہی دنوں میں، مئی 1945ء میں، مکمل طور پر غیر مشروط ہتھیار ڈال دیے — بالکل اُسی منظر کی مانند جسے حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ جب یاجوج و ماجوج کی گردنوں پر کیڑے حملہ آور ہوتے ہیں تو وہ یکایک ہلاک ہو جاتے ہیں۔

تعبیر سے متعلق سوالات

دجال اور یاجوج و ماجوج کے متوازی بیانیے

صحیح مسلم کی حدیث[141] میں دجال کے واقعات پہلے اور یاجوج و ماجوج کے واقعات بعد میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس ترتیب سے یہ تاثر پیدا ہو سکتا ہے کہ دجال کی موت یاجوج و ماجوج کے حملے سے پہلے ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ دونوں واقعات ساتھ ساتھ وقوع پذیر ہوئے، جیسا کہ متوازی بیانیوں میں عام طور پر ہوتا ہے، جہاں ایک موضوع کو مکمل بیان کر کے دوسرے متوازی موضوع کی طرف منتقل ہوا جاتا ہے — خواہ دونوں واقعات تاریخی طور پر ایک ہی دور میں واقع ہوئے ہوں۔

اس سیاق میں، دجال سے مراد سوویت یونین ہے، جو 1922 میں قائم ہوا اور 1991 میں ختم ہوا؛ جبکہ یاجوج و ماجوج سے مراد نازی جرمنی ہے، جس نے 1939 سے 1945 کے دوران دوسری جنگِ عظیم میں مہلک حملے کیے۔ چونکہ سوویت یونین کا ظہور نازی جرمنی سے پہلے ہوا، اس لیے حدیث میں اس کا تذکرہ اور انجام پہلے بیان کیا گیا، جب کہ یاجوج و ماجوج کے واقعات کو بعد میں تفصیل سے بیان کیا گیا — جیسا کہ متوازی بیانیوں میں عمومی طور پر ہوتا ہے۔

مزید برآں، حدیث کے مطابق دجال کی ہلاکت کے بعد سات سال کا ایک پُرامن دور آئے گا، جس کے اختتام پر ٹھنڈی ہوائیں چلیں گی جو ہر اس شخص کی روح قبض کر لیں گی، جس کے دل میں رتی برابر بھی ایمان موجود ہو گا۔[142] اگر یہ مفروضہ اختیار کیا جائے کہ یاجوج وماجوج کا فتنہ دجال کے بعد ظاہر ہوا اور پھر ان کے بعد یہ ہوائیں چلیں، تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ یاجوج وماجوج کا عظیم فساد اسی سات سالہ پُرامن دور میں برپا ہوا—جو کہ اس دور کے "پُرامن" ہونے کے تصور سے سراسر متصادم ہے۔ یہ تضاد اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ یاجوج وماجوج کا خروج دجال کے فتنے کے ساتھ متوازی تھا، یعنی دونوں فتنوں کا ظہور ایک ہی تاریخی عرصے میں ہوا۔ حدیث میں یاجوج وماجوج کا تذکرہ بعد میں آنا صرف اسلوبِ بیان اور ترتیبِ تفصیل کا حصہ ہے، نہ کہ اس سے مراد زمانی ترتیب ہے۔

احادیث میں یاجوج اور ماجوج اور نازی جرمنی

احادیث میں خاص طور پر نازی جرمنی کو یاجوج وماجوج سے تعبیر کیا گیا ہے، حالانکہ دوسری جنگِ عظیم میں اتحادی افواج کی دیگر یورپی اقوام بھی شامل تھیں، جو تاریخی ونسلی اعتبار سے یاجوج وماجوج اقوام کا حصہ ہیں۔ اس تخصیص کا مقصد دراصل وضاحت اور صاف گوئی ہے تاکہ یہ مغالطہ پیدا نہ ہو کہ یہ احادیث جنگ کے کس فریق کی جانب اشارہ کر رہی ہیں۔

یاجوج وماجوج کی پہچان ہمیشہ شمال کی اُن اقوام سے کی گئی ہے جو دوسری قوموں پر چڑھائی کر کے تباہی مچاتی ہیں، اور ان کے وسائل کو بے دریغ لوٹتی ہیں۔ یہی صفات نازی جرمنی کے طرزِ عمل میں پوری شدت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اس وجہ سے نازی جرمنی کو خصوصًا ان احادیث میں یاجوج وماجوج سے تشبیہ دی گئی ہے تاکہ مفہوم میں ابہام باقی نہ رہے۔

حوالہ جات

114) Genesis 10:2: https://www.bible.com/bible/1/GEN.15.18-20.KJV

115) Ezekiel 38:2-3: https://www.bible.com/bible/111/EZK.38.2-3.NIV

116) Ezekiel 39:2: https://www.bible.com/bible/111/EZK.39.2.NIV

117) Ezekiel 38:15: https://www.bible.com/bible/111/EZK.38.15.NIV

118) "معبد کی مکروہ بربادی" بائبلی پیش گوئی سے ماخوذ ہے، خاص طور پر کتابِ دانیال میں۔ یہ اس واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے جب یونانی دیوتا زیوس کے لیے قربان گاہ قائم کی گئی اور یہودی ہیکلِ مقدس میں خنزیر کی قربانی دی گئی، جس نے اس مقدس مقام کو ویران اور ناپاک بنا دیا۔

119) Rolf Strootman, 'The Seleukid Empire', in: R. Mairs ed., The Graeco-Bactrian and Indo-Greek World. Routledge Worlds (London and New York: Routledge, 2021) 11–37.

120) Quran 18:93-98: https://quran.com/18/93-98
121) Daniel 8: https://www.bible.com/bible/111/DAN.8.NIV
122) https://en.wikipedia.org/wiki/Darial_Gorge
123) سفر یوسیپون (Sefer Josippon)، دسویں صدی عیسوی کی عبرانی تاریخ۔
124) https://jewishencyclopedia.com/articles/10279-magog
125) Revelation 20:7-9: https://www.bible.com/bible/111/REV.20.7-9.NIV
126) Revelation 19:11: https://www.bible.com/bible/111/REV.19.11.NIV
127) جاوید احمد غامدی، میزان (علامات قیامت)
128) جارج لیپوویچ، "یورپ میں الان اور سرماتی اقوام":
https://www.academia.edu/17774436/Alans_and_Sarmatians_in_Europe
129) Quran 21:96: https://quran.com/21/96
130) https://www.gilderlehrman.org/history-resources/spotlight-primary-source/doctrine-discovery-1493
131) Sahih Bukhari 3347: https://sunnah.com/bukhari:3347
132) Revelation 20:7-9: https://www.bible.com/bible/111/REV.20.7-9.NIV
133) Quran 18:99: https://quran.com/18/99
134) Quran 7:54: https://quran.com/7/54
135) Quran 21:96-97: https://quran.com/21/96-97
136) Quran 21:96 https://quran.com/21/96
137) Sahih Muslim 2937a: https://sunnah.com/muslim:2937a
138) Sahih Muslim 2937a: https://sunnah.com/muslim:2937a
139) Sahih Muslim 2937b: https://sunnah.com/muslim:2937b
140) Sahih Muslim 2937a: https://sunnah.com/muslim:2937a
141) Sahih Muslim 2937a: https://sunnah.com/muslim:2937a
142) Sahih Muslim 2940a: https://sunnah.com/muslim:2940a

(جاری)

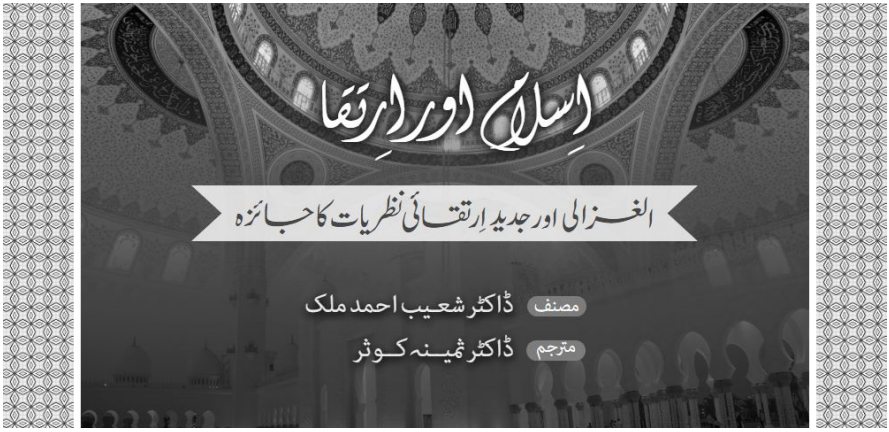

مسلم فکر اور نظریہ ارتقا

تعارف

گذشتہ صفحات میں ہم نے عیسائی سیاق وسباق میں نظریہ ارتقا سے متعلق چار اہم موضوعات کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد باب 3 میں، ہم نے اسلامی صحیفے کا مطالعہ کیا، جہاں ارتقا سے متعلق مختلف قرآنی آیات اور احادیث کو سامنے رکھ کر عیسائی مفکرین اور مذہبی گروہوں کے مؤقف کا اسلامی تناظر میں موازنہ اور تجزیہ کیا گیا۔ اس تجزیے کے دوران کچھ ایسے نکات بھی سامنے آئے جو اسلامی تناظر کے باوجود، عیسائی سیاق کے لیے زیادہ موزوں یا اہم دکھائی دیے۔ یہاں ہم اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے ان مسلم مفکرین کے دلائل کا جائزہ لیں گے جنہوں نے اسلام اور نظریہ ارتقا کے مابین مطابقت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم اس بحث کو مؤثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان مختلف درجہ بندیوں (classification schemes) کو بھی سمجھیں، جو اس موضوع کو منظم انداز میں سمجھنے کے لیے تجویز کی گئی ہیں۔ یقیناً ہر درجہ بندی کسی مخصوص زاویے کو مدنظر رکھتے ہوئے تشکیل دی جاتی ہے، جس کے ذریعے مصنف یا محقق وہ نکات اجاگر کرنا چاہتا ہے جو اس کے لیے زیادہ اہم ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ خطرہ بھی موجود رہتا ہے کہ یہ درجہ بندیاں کسی اور سیاق و سباق میں، بالخصوص مسلم فکری روایت پر پوری طرح لاگو نہ ہو سکیں۔ مثلاً بعض درجہ بندیاں امریکہ یا مغرب کے مخصوص فکری ماحول کے لیے بہت موزوں ہیں، مگر وہ مسلم تناظر میں قدرے غیر فطری یا غیر متعلق محسوس ہوتی ہیں۔ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا حصہ ان مختلف درجہ بندیوں اور فریم ورکس کا تنقیدی جائزہ پیش کرتا ہے جو ارتقا اور مذہب کے تعلق کو سمجھنے کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ ہم یہاں دیکھیں گے کہ ان درجہ بندیوں پر کی جانے والی تنقیدات کیا ہیں، اور ان میں سے

کون سا فریم ورک زیادہ موزوں ہو سکتا ہے۔ آخر میں ہم ایک مخصوص درجہ بندی کو اختیار کریں گے جو صرف اور صرف مشترکہ نسب (common ancestry) کے مسئلے پر مرکوز ہے، وہیں اس انتخاب کی عقلی توجیہ بھی بیان کی جائے گی۔ دوسرا حصہ اسی منتخب درجہ بندی کو مسلم مفکرین کے بیانات، افکار اور تحریروں پر لاگو کرے گا۔ اس حصے میں ایک جامع جدول (summary table) بھی شامل کیا جائے گا جس میں یہ واضح کیا جائے گا کہ ہر مفکر مشترکہ نسب کے تصور سے کس حد تک اتفاق یا اختلاف کرتا ہے، اور اس کی کیا وجوہات ہیں۔

درجہ بندیوں کا جائزہ

اسلام اور ارتقا کے حوالے سے لوگوں کی آرا کو کس طرح ترتیب دیا جائے اور ان کی درجہ بندی کیسے جائے؟ یہ ایک نہایت پیچیدہ اور محنت طلب کام ہے۔ جیسا کہ ہم باب اول میں دیکھ چکے ہیں، ارتقا ایک کثیر المضامین (multipropositional) نظریہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں، ارتقا کو بیان کرنے کے لیے کئی پہلو بیک وقت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں "طویل زمانی تسلسل" (deep time) اور "مشترکہ نسب" (common ancestry) شامل ہیں، جبکہ بے ترتیب تغیرات (random mutation) اور قدرتی انتخاب (natural selection) جیسے عوامل اسے نیو ڈارونیت (Neo-Darwinism) کی شکل دیتے ہیں۔ اسی لیے جب لوگوں سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا وہ "ارتقا" پر یقین رکھتے ہیں یا نہیں، اور یہ سوال ایک مجموعی اور مبہم انداز میں کیا جاتا ہے، تو اس میں ایک بڑی الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے جواب صرف دو میں سے ایک ہو سکتا ہے یعنی ہاں یا ناں، حالانکہ معاملہ اتنا سادہ نہیں ہوتا۔ ہم یہ نہیں جان پاتے کہ وہ اصل میں ارتقا کے کس پہلو کو قبول یا رد کر رہے ہیں۔ کیا وہ طویل زمانی عمل (یعنی زمین اور زندگی کی قدیم تاریخ) کو نہیں مانتے؟ یا مشترکہ نسب (یعنی تمام جانداروں کا ایک ہی جد امجد ہونا) کو؟ یا پھر وہ ارتقا کے سائنسی طریقۂ کار جیسے بے ترتیب تغیر اور قدرتی انتخاب کو مسترد کر رہے ہیں؟ یا شاید وہ ان تمام باتوں کو ایک ساتھ رد کر رہے ہیں؟ اگر "ارتقا" کو ایک ہی جامع اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جائے تو ان مختلف اور اہم اجزاء میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے، اور بحث مبہم ہو جاتی ہے۔

اس مسئلے کے علاوہ ایک اور پیچیدگی مفاہیم (connotations) سے متعلق ہے۔ "ارتقا" اور "(نیو) ڈارونیت" بعض سیاق و سباق میں ایسے بھاری بھرکم مفہوم کی حامل اصطلاحات بن چکی ہیں کہ وہ سننے والے کے ذہن میں فوراً الحاد، مادہ پرستی اور فطرت پرستی جیسے تصورات کو جنم دیتی ہیں۔ حالانکہ یہ تصورات منطقی طور پر ارتقا سے لازم و ملزوم نہیں۔ یعنی، ارتقا پر یقین رکھنے کا لازمی مطلب الحاد یا مادہ پرستی نہیں ہے۔ تاہم تاریخی اور سماجی حوالوں سے ارتقا کو تھیزم بمقابلہ الحاد کی بحث میں اتنا الجھا دیا گیا ہے کہ "ارتقا" یا "ڈارونیت" جیسی اصطلاحات اپنی غیر جانب داری کھو چکی ہیں۔ مشہور نیو ایتھیسٹ ریچرڈ ڈاکنز جیسے مفکرین ارتقا اور الحاد کو ہم معنی بنا کر پیش کرتے ہیں، اسی لیے وہ پر زور انداز میں کہتے ہیں کہ آدمی

یا تو مومن ہو سکتا ہے یا ارتقائی مفکر (believer or evolutionist)، درمیانی راستہ کوئی نہیں (Elsdon-Baker 2009; 2017)۔ یہی زبان، یہی اندازِ استدلال، اور یہی سادہ ثنویت (binarism) اس اہم علمی بحث کو غیر ضروری الجھاؤ کا شکار بنا دیتی ہے۔ اسی طرح عوامی سطح پر سائنسی اصطلاحات کے عمومی فہم میں بھی الجھن پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ ہم باب اول میں دیکھ چکے ہیں، جیسے "نظریہ" (theory) کا مطلب وہ نہیں ہوتا جو روز مرہ بول چال میں لیا جاتا ہے۔ لیکن عام لوگ اس فرق سے ناآشنا ہوتے ہیں، اور یوں "نظریہ ارتقا" کو محض ایک قیاس یا غیر مصدقہ رائے سمجھ کر رد کر دیتے ہیں۔

ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے، مسلمانوں کے ہاں ارتقا سے متعلق سروے اور شماریاتی ڈیٹا کو بہت محتاط انداز میں پڑھنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً ریاض حسن (2007) نے متعدّد مسلم اکثریتی ممالک میں ایک جامع سروے کیا، جن میں مصر، قازقستان، انڈونیشیا، پاکستان، ترکی اور ملائیشیا شامل تھے۔ اس سروے میں یہ سوال پوچھا گیا تھا "کیا آپ ڈارون کے نظریہ ارتقا سے اتفاق کرتے ہیں یا اختلاف؟" کارلائل وغیرہ (152:2019) نے اس سوال پر تنقید کرتے ہوئے بجا طور پر درج ذیل نکات اٹھائے:

یہ سوال کئی حوالوں سے مسئلہ پیدا کرتا ہے۔ اول، یہ فرض کرتا ہے کہ جواب دینے والے کو ڈارونیت کی تفصیلات کا علم ہے۔ دوم، اس میں 'نظریہ' کا لفظ استعمال ہوا ہے، جسے عام لوگ شک یا غیر یقینی کے مفہوم میں لیتے ہیں، قطع نظر اس کے کہ سائنسی برادری میں ارتقا کتنی اچھی طرح سے ثابت شدہ حقیقت ہے۔ سوم، یہ سوال ایک جدید تحقیقی شعبے کو صرف ڈارون سے منسوب کر کے ایک تاریخی شخصیت سے جوڑ دیتا ہے، جس سے ارتقا کا سائنسی تصور مغربی استعماری مادہ پرستی کی علامت بن جاتا ہے۔ آخر میں، یہ سوال انسانی اور غیر انسانی ارتقا کے درمیان فرق نہیں کرتا (Carlisle et al. (2019, 152۔

کارلائل وغیرہ کی یہ آخری تنقید خاص طور پر قابلِ غور ہے، کیونکہ بعض مسلم مفکرین انسانی ارتقا اور غیر انسانی (یعنی جانوروں و نباتات) ارتقا میں فرق کرتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اس فرق سے ناآشنا ہوتے ہیں، وہ پورے ارتقائی نظریے کو یکسر مسترد کر دیتے ہیں۔ یہی مسئلہ ہمیں Pew World Muslim Poll (2013) میں نظر آتا ہے، جس میں درج ذیل سوال اور جوابی اختیارات دیے گئے تھے:

ارتقا کے بارے میں سوچتے ہوئے، درج ذیل میں سے کون سا جواب آپ کے خیال سے زیادہ قریب ہے؟

- انسان اور دیگر جاندار وقت کے ساتھ ساتھ ارتقائی عمل سے گزرے ہیں
- انسان اور دیگر جاندار ابتداء سے اپنی موجودہ شکل میں موجود ہیں
- معلوم نہیں

ایلزڈن بیکر (2015) نے اس سوال کو بھی مسئلہ قرار دیا ہے، کیونکہ اس کا فریم امریکی ماحول سے شدید متاثر ہے، جہاں "سب کچھ مانو یا کچھ بھی نہیں" کا رجحان پایا جاتا ہے (Elsdon-Baker 2015, 434)۔ وہ بجا طور پر اس بات کو اجاگر کرتی ہیں کہ ہمارے سروے کے انداز اور سوالات کا طریقہ خود بخود ایسے افراد پیدا کر دیتا ہے جو تخلیق پرستی (creationism) کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ انسانی اور غیر انسانی ارتقا کے درمیان فرق کرنا اس بحث کو زیادہ مؤثر اور متوازن بنا سکتا ہے، کیونکہ اس سے ارتقا کو مکمل طور پر رد کرنے کے بجائے جزوی طور پر قبول کرنے کی گنجائش نکلتی ہے۔

مثال کے طور پر Unsworth and Voas (2018) نے اپنے سروے میں ان دونوں پہلوؤں کو الگ الگ پرکھا۔ انہوں نے 815 مسلمانوں پر مشتمل نمونے کے ذریعے مختلف مذہبی گروہوں کے ردعمل کا جائزہ لیا۔ ان کے نتائج سے پتا چلا کہ جب غیر انسانی ارتقا (یعنی پودوں اور جانوروں کی ارتقائی تبدیلی) کی بات کی گئی تو 42.4 فیصد شرکا نے اس سے مضبوط اتفاق ظاہر کیا، جبکہ صرف 26.2 فیصد نے اس سے سخت اختلاف کیا۔ باقی شرکا نے کوئی واضح رائے نہیں دی۔ دوسری جانب، جب سوال انسانی ارتقا سے متعلق تھا تو صرف 26.9 فیصد شرکا نے اس کی حمایت کی، جبکہ 44.2 فیصد نے اس سے واضح اختلاف کیا۔ باقی شرکا غیر جانب دار رہے۔

یہ اعداد و شمار اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ انسانی اور غیر انسانی ارتقا کے درمیان فرق کرنا نہایت اہم ہے، اور اس فرق کو ملحوظ رکھے بغیر کوئی درست یا متوازن رائے قائم کرنا مشکل ہو سکتا ہے (also see Elsdon-Baker et al. 2017)۔

ایلزڈن بیکر کی یہ بات بھی وضاحت طلب ہے کہ کس طرح بعض چیزوں کو امریکی ماحول میں ایک خاص انداز سے پیش کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے باب 2 اور 3 میں دیکھ چکے ہیں، کچھ موضوعات بعض عیسائی حلقوں میں مسلم حلقوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ حساسیت کے حامل ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر ہم ایسی درجہ بندی اپنائیں جو ان حساسیتوں کو ایک سیاق و سباق سے اٹھا کر کسی دوسرے سیاق میں جوں کا توں منتقل کر دے، تو یہ طریقہ کار زیادہ مفید نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر، Eugenie Scott (2002) کی جانب سے پیش کردہ درجہ بندی کو دیکھیں، جو مختلف آرا کے ایک تسلسل پر مبنی ہے اور امریکی سیاق میں موجود مذہبی اور سائنسی حساسیتوں کو مدنظر رکھ کر ترتیب دی گئی ہے۔

اصل کتاب کے صفحہ 109 پر موجود Table 4.1 کو دیکھیں تو اس کے بالائی اور نچلی سطحیں آرا کے ایک تسلسل کے دو انتہاؤں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ Eugenie Scott اس درجہ بندی کا آغاز اُن لوگوں سے کرتی ہیں جو زمین کو بالکل چپٹی (flat earth) مانتے ہیں، اور اس کا اختتام مکمل مادیاتی ارتقا (materialist evolution) پر ہوتا ہے، جس کا مطلب خدا کے تصور کا انکار ہوتا ہے۔ یہ درجہ بندی امریکی تناظر میں شاید موزوں ہو، جہاں بعض مذہبی گروہ سائنسی علم کے پورے دائرے کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ Scott نے اس تسلسل میں flat earthers

(زمین کو چپٹا ماننے والے) اور geocentrists (زمین کو کائنات کا مرکز ماننے والے) جیسے گروہوں کو بھی شامل کیا۔ مگر یہ سوچنا کہ یہی درجہ بندی مسلم دنیا پر بھی اسی طرح لاگو کی جا سکتی ہے، ایک محتاط جائزے کے بغیر درست نہیں ہوگا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلم دنیا میں flat earthers یا geocentrists موجود ہی نہیں۔ ممکن ہے کہ وہ پائے جاتے ہوں۔ 2017 میں تیونس کی ایک طالبہ نے ایک تھیسس جمع کروایا جس میں اس نے دعویٰ کیا کہ زمین کی عمر صرف 13 ہزار پانچ سو سال ہے، یہ ساکن ہے اور کائنات کا مرکز بھی ہے (Guessoum 2017)۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا یہ صرف ایک انفرادی کیس ہے یا پھر ایک وسیع تر رجحان؟ اس کا تعین کیے بغیر مسلم تناظر میں ایسی درجہ بندی کو اپنانا قبل از وقت ہوگا۔ Unsworth and Voas (2018, 82) کی تحقیق کی طرف واپس آئیں تو ان کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ 50 فیصد مسلمان شرکا نے اس بات سے واضح اتفاق کیا کہ زمین کی عمر اربوں سال ہے، جبکہ صرف 5.5 فیصد نے اس سے سخت اختلاف کیا (باقی شرکا غیر جانبدار رہے)۔ یہ سب یہ ظاہر کرتا ہے کہ شاید مسلم دنیا میں زمین کو چپٹا ماننے کا رجحان زیادہ عام یا فکری مسئلہ نہیں ہے مگر یہ بات بھی صرف احتیاط کے ساتھ ہی کہی جا سکتی ہے۔

اس درجہ بندی کا ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ اس میں سائنسی عقائد کو خدا پر ایمان یا انکار سے مربوط کر کے یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس تسلسل (spectrum) میں ایک طرف وہ مقام ہے جہاں سائنسی اور مذہبی عقائد سے کم از کم مطابقت پائی جاتی ہے، جبکہ دوسری طرف وہ مقام ہے جہاں سائنسی نظریات سے مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے لیکن ساتھ ہی خدا کے وجود کا انکار بھی کیا جاتا ہے (Huskinson 2020, 9)۔ اس درجہ بندی میں موجود یہ دہرا میلان دراصل اسی "دو انتہاؤں کی طرف کھینچنے والے رجحان" (bifurcation tendency) کو نمایاں کرتا ہے جس کی طرف پہلے رچرڈ ڈاکنز کے تناظر میں اشارہ کیا گیا تھا۔ اس درجہ بندی سے یہ تاثر ملتا ہے کہ اگر کوئی شخص سائنسی سوچ رکھتا ہے تو اسے لازماً خدا کے وجود کا انکار کرنا ہوگا، جو کہ ایک غیر ضروری اور غیر منطقی تصور ہے۔

ان مشاہدات کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کسی ایک مخصوص سماجی یا فکری سیاق میں تیار کی گئی درجہ بندی کو کسی دوسرے تناظر پر لاگو کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ بصورت دیگر، یہ درجہ بندیاں غلط فہمی، فکری الجھن اور غیر موزوں نتائج کا سبب بن سکتی ہیں۔

کچھ مسلم مفکرین جنہوں نے اسلام اور نظریہ ارتقا کے مابین ہونے والی علمی بحث کا جائزہ لیا ہے، انہوں نے اس موضوع کو مختلف انداز میں درجہ بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ جسّوم (Guessoum, 2016) نے اس کے لیے ایک تین سطحی درجہ بندی اپنائی، جس میں وہ افراد شامل ہیں جو ارتقا کو مکمل طور پر رد کرتے ہیں (rejectionists)، وہ جو درمیانی یا معتدل رائے رکھتے ہیں (moderates)، اور وہ جو ارتقا کے حامی ہیں (pro-evolutionists)۔ مالک (Malik 2018; 2019) نے جسّوم کی درجہ بندی کو اختیار کرتے ہوئے ملتا جلتا خاکہ پیش کیا، لیکن انہوں نے اصطلاحات میں قدرے تبدیلی کی۔ وہ "رد" (rejection)، "موافقت" (accommodative)، اور "قبولیت" (

acceptance) کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ مالک اور جسّوم کی درجہ بندی میں Eugenie Scott کے ماڈل کے مقابلے میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ ان کے ہاں ارتقا کو قبول کرنے کے لیے خدا کے انکار کی شرط نہیں ہے۔ یہ تصور خاص طور پر مسلم تناظر میں زیادہ معقول محسوس ہوتا ہے۔ اس درجہ بندی کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ہر گروہ (خیمہ) میں مختلف وجوہات کی بنیاد پر افراد کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے، بعض مفکرین جو ارتقا کو مکمل طور پر قبول یا رد کرتے ہیں، ان کے دلائل سائنسی بھی ہو سکتے ہیں، الہیاتی (theological) بھی، یا پھر تفسیری اصولوں (hermeneutic) پر مبنی بھی یا ان سب کا مجموعہ۔ چنانچہ جسّوم اور مالک کا اندازِ درجہ بندی ان مختلف جہات کو سنبھالنے میں مدد دیتا ہے۔

البتہ اس اسکیم میں ایک کمزوری یہ ہے کہ کسی مفکر کے مؤقف کو قبول یا رد کے زمرے میں شامل کرنا دراصل اس شخص کی اپنی رائے نہیں بلکہ درجہ بندی کرنے والے کی تشریح پر منحصر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، جسّوم اور مالک دونوں ڈیوڈ سولومن جلاجیل (David Solomon Jalajel) کو "رد کرنے والوں" کے زمرے میں رکھتے ہیں (Guessoum 2016; Malik 2019, 210)، حالانکہ خود جلاجیل (2018) اپنے مؤقف کو ارتقا سے مکمل طور پر ہم آہنگ سمجھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات درجہ بندی کرنے والے کی تشریح اور اصل مفکر کی خود فہمی میں تضاد ہو سکتا ہے۔ اس درجہ بندی کا ایک اور ممکنہ مسئلہ یہ ہے کہ چونکہ یہ بہت وسیع اصطلاحات پر مشتمل ہے، اس لیے بعض اوقات مختلف آرا کا تقابلی مطالعہ مشکل ہو جاتا ہے۔ اتفاق یا اختلاف کی وجوہات کئی پہلوؤں سے پیدا ہو سکتی ہیں — جیسے سائنسی تشخیص، مابعد الطبیعی اصول (metaphysical principles)، یا تفسیر سے متعلق وابستگیاں۔ لہٰذا ان اختلافات یا اتفاقات کو کسی ایک مشترک بنیاد پر پرکھنا ایک چیلنج بن سکتا ہے۔

اس عنوان پر موجود علمی ذخیرے میں ایک اور اہم درجہ بندی غفوری فرد اور محمد اکرمی (2011) کی طرف سے پیش کی گئی ہے۔ ان کی درجہ بندی چار اقسام پر مشتمل ہے، اور اس کا بنیادی محور قرآن و سنت اور سائنسی علم کے درمیان تعلق ہے۔ پہلا گروہ یہ سمجھتا ہے کہ ارتقا محض ایک "نظریہ" ہے، لیکن انسان کی تخلیق کو ایسے انداز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس سے وہ ارتقا کے تصور سے ہم آہنگ ہو جائے۔ دوسرا گروہ یہ مؤقف رکھتا ہے کہ قرآن و حدیث کے متون بالکل واضح ہیں اور انسان کی تخلیق کی تعبیر کی کوئی گنجائش نہیں۔ لہٰذا اگر ارتقا درست بھی ہو، تب بھی انسان اس سے مستثنیٰ ہے۔ تیسرا گروہ یہ خیال رکھتا ہے کہ قرآن اور سائنس بالکل مختلف دائروں میں کام کرتے ہیں، یعنی ان کا باہمی تعلق یا براہِ راست مکالمہ ممکن نہیں۔ ان کے نزدیک قرآن سائنسی کتاب نہیں، اس لیے سائنسی نظریات پر ایمان رکھنا یا نہ رکھنا غیر متعلق ہے۔ چوتھا گروہ یہ مؤقف اختیار کرتا ہے کہ انسانی ارتقا کو براہِ راست قرآن سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ یہ گروہ سائنس کی صحت اور اسلامی متن سے انسانی ارتقا کی قطعی تعبیر کا قائل ہے۔ اس گروہ اور پہلے گروہ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پہلا گروہ ارتقا کو ممکن بنانے کے امکانات پر زور دیتا ہے، جبکہ چوتھا گروہ اسے یقینی حقیقت کے طور پر مانتا ہے۔

اگرچہ یہ درجہ بندی خاص طور پر انسانی ارتقا پر مرکوز ہے، مگر اس میں ایک بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ یہ مختلف فکری وابستگیوں (epistemic commitments)، تفسیری رجحانات (hermeneutic commitments)، اور سائنس ووحی کے باہمی تعلق کو ایک ہی سانچے میں سمو دینے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بعض علمی یا فکری موقف محض درجہ بندی کی نوعیت کے باعث ایک دوسرے سے غیر ضروری طور پر مختلف نظر آتے ہیں، حالانکہ وہ صرف شدت یا درجے میں مختلف ہوتے ہیں، نوعیت میں نہیں۔

مثال کے طور پر، پہلا اور چوتھا گروہ بظاہر ایک ہی سمت میں سوچتے ہیں، لیکن ان کے درمیان فرق محض یقین کی شدت کا ہے، نہ کہ بنیادی موقف کا۔ اس درجہ بندی میں ایک اور کمی یہ ہے کہ وہ اُن افراد کو شامل نہیں کرتی جو صرف ایک پہلو (مثلاً صرف سائنسی دلیل) کی بنیاد پر ارتقا کو قبول یا رد کرتے ہیں، اور دینی متون پر کوئی واضح رائے نہیں رکھتے۔ یعنی ایک فرد صرف اس بنیاد پر ارتقا کو مسترد کرتا ہے کہ موجودہ سائنسی دلائل اسے قائل نہیں کرتے، لیکن وہ دینی متون سے متعلق کوئی مؤقف نہیں رکھتا۔ ایسے شخص کو اس درجہ بندی میں کسی واضح خانے میں رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

آخر میں، خود مصنفین کے مطابق، کچھ مفکرین ایسے بھی ہوتے ہیں جو ارتقا کو سائنس یا دینی دلائل کے بجائے کسی مابعد الطبیعیاتی نقطہ نظر سے قبول یا رد کرتے ہیں۔ سید حسین نصر اس کی ایک واضح مثال ہیں، جن کے ہاں ارتقا کو رد کرنے کی بنیادی وجہ ان کا وہ روحانی مابعد الطبیعیاتی وژن ہے جس میں ارتقا کا کوئی وجود ممکن نہیں۔ ان کے نزدیک سائنس یا تفسیر کی بحث ثانوی ہے، جس کے باعث ان کے مؤقف کو اس درجہ بندی میں رکھنا مزید پیچیدہ ہو جاتا ہے۔

یقیناً، ہر درجہ بندی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ درجہ بندی کرنے والا کس پہلو کو نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ جسّوم (2016) اور مالک (2018؛ 2019) کے ہاں یہ جھکاؤ واضح نظر آتا ہے کہ وہ ایک وسیع اور جامع درجہ بندی اختیار کرتے ہیں جو علمی ادب میں موجود مختلف آرا کو سمیٹ سکے، بالخصوص ان کے درمیان مطابقت یا عدم مطابقت پر توجہ دیتے ہیں۔ اس کے برعکس غفوری فرد اور محمد اکرمی (2011) کی درجہ بندی کا محور زیادہ تر سائنس اور وحی کے باہمی تعلق پر مرکوز ہے۔ ہر نظام درجہ بندی کی اپنی خوبیاں بھی ہیں اور مشکلات بھی۔ اس کتاب میں جو درجہ بندی اختیار کی گئی ہے، وہ نہ صرف مذکورہ دونوں نظاموں میں بیان کردہ مسائل کو سنجیدگی سے لیتی ہے بلکہ پہلے بیان کیے گئے دیگر نکات کو بھی مدنظر رکھتی ہے۔ اس درجہ بندی کو وضع کرنے میں تین بنیادی اصول رہنمائی کرتے ہیں:

پہلا اصول:

مرکزی بنیاد کے طور پر مشترکہ نسب (common ancestry) پر توجہ مرکوز کرنا۔ چونکہ اصل بحث کا مرکز انسانی ارتقا ہے، اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ مشترکہ نسب کو درجہ بندی کا واحد اور اساسی معیار بنایا جائے۔ یہی وہ نکتہ ہے جو مختلف مفکرین کے موقف کو ایک واضح معیار پر جانچنے کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

دوسرا اصول:

اس بات کو الگ کرنا کہ کوئی شخص ارتقا کو کیوں قبول یا مسترد کرتا ہے، اور وہ ارتقا کے کن اجزا کو مشترکہ نسب کے تحت مانتا یا نہیں مانتا۔ چونکہ مختلف مفکرین ارتقا کو سائنسی، مابعد الطبیعیاتی (metaphysical)، یا تفسیری (hermeneutic) زاویوں سے قبول یا رد کرتے ہیں، اس لیے ان کے اسباب کو خود درجہ بندی سے الگ رکھنا زیادہ مفید سمجھا گیا۔ اس سے درجہ بندی سادہ، قابلِ فہم اور موازنہ کے لیے آسان ہو جاتی ہے۔

تیسرا اصول:

مطابقت پذیری (reconciliation) کے سوال کو درجہ بندی سے الگ رکھنا۔ یہ اصول دوسرے اصول سے ملتا جلتا محسوس ہو سکتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ ایک الگ نکتہ ہے۔ ارتقا پر ایمان رکھنا ایک بات ہے، اور اسے اپنے دینی عقائد سے ہم آہنگ کرنا (یا نہ کرنا) ایک اور بات۔ اس اصول کو اختیار کرنے سے اس مسئلے سے بچا جا سکتا ہے جس میں درجہ بندی کرنے والے اور متعلقہ مفکر کے ذاتی موقف کے درمیان فہم کا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ آگے چل کر واضح کیا جائے گا کہ یہ نکتہ کس طرح اہم ثابت ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا اصولوں کی روشنی میں اصل کتاب کے صفحہ 111 پر موجود Table 4.2 میں ایک نئی درجہ بندی کا نظام پیش کیا گیا ہے، جو زیادہ منظم، سادہ، اور فکری تنوع کو بہتر طور پر سنبھالنے کے قابل ہے۔

مشترکہ نسب (common ancestry) میں کیا شامل ہے اور کیا نہیں، اس کا خلاصہ تین بنیادی زمروں میں کیا جا سکتا ہے: غیر انسانی مخلوقات، انسان، اور آدم علیہ السلام۔ سادگی کے لیے "آدمی استثنائیت" (Adamic exceptionalism) کے تحت حضرت حوّا کو بھی حضرت آدم کے ساتھ شامل کر لیا جاتا ہے، کیونکہ دونوں کو معجزاتی طور پر پیدا شدہ مانا جاتا ہے۔ اگر کوئی مفکر یہ مؤقف رکھتا ہے کہ ہر مخلوق ارتقائی عمل سے خارج ہے، یعنی کوئی بھی ارتقا کا حصہ نہیں، تو اسے تخلیقیت (Creationism) کہا جاتا ہے۔ انسانی استثنائیت (Human Exceptionalism) کا مطلب یہ ہے کہ غیر انسانی مخلوقات (مثلاً جانور، پودے وغیرہ) کے ارتقا کو تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن حضرت آدم (جنہیں اس تناظر میں پہلا انسان مانا جاتا ہے) اور پوری انسانیت کو ارتقا کا نتیجہ نہیں سمجھا جاتا۔ آدمی استثنائیت (Adamic Exceptionalism) کا مطلب یہ ہے کہ غیر انسانی مخلوقات اور انسان دونوں ارتقا کے ذریعے وجود میں آئے، لیکن صرف حضرت آدم ارتقائی عمل سے مستثنیٰ ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت آدم کو پہلا انسان نہیں مانا جاتا، بلکہ وہ ایک معجزاتی استثناء تھے۔ آخر میں، بلا استثنا مؤقف (No Exceptions) وہ نظریہ ہے جس میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ارتقائی عمل سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں۔ یعنی غیر انسانی مخلوقات، انسان اور حضرت آدم سب ارتقائی عمل کے تحت وجود میں آئے ہیں۔ (جاری)

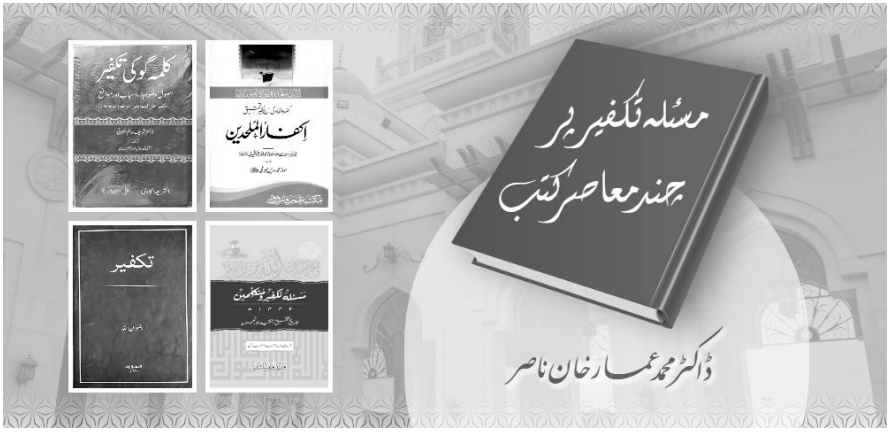

تکفیر کا مسئلہ اسلامی روایت میں ہمیشہ سے ایک اہم اور قابل بحث مسئلہ رہا ہے۔ فقہ اور عقیدہ کی کتابوں میں اس پر ضمناً بھی کلام کیا جاتا ہے، جبکہ امام غزالیؒ، امام ابن تیمیہؒ اور علامہ شعرانیؒ وغیرہم کی مستقل تصانیف بھی اس موضوع پر موجود ہیں جن کا بنیادی ارتکاز مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی تکفیر کے مسئلے پر ہے۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے فتاویٰ میں بھی اس کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی کلام موجود ہے۔

معاصر تناظر میں یہ مسئلہ کئی مختلف جہتوں سے زیر بحث ہے۔ اس کا ایک سیاق قادیانی جماعت کا ظہور اور اس کی تکفیر ہے۔ ایک دوسرا سیاق برصغیر میں بریلوی دیوبندی نزاع میں تکفیر کے اصول کا اطلاق ہے۔ ایک تیسرا اور زیادہ اہم سیاق جدید دور میں مسلم حکمرانوں کی تکفیر کی بنیاد پر ان کے خلاف خروج کا موقف رکھنے والی تحریکوں کا ہے۔

پیش نظر کتب میں سے پہلی کتاب علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی ''اکفار الملحدین'' کا اردو ترجمہ ہے۔ کتاب کا بنیادی مدعا یہ ہے کہ قطعیات دین میں تاویل وغیرہ کا اصول تکفیر سے مانع نہیں اور یہ کہ اہل قبلہ کی عدم تکفیر کا قاعدہ کئی شرائط اور قیود کے ساتھ مقید ہے۔ یہ قادیانی مسئلے کے تناظر میں لکھی گئی کتاب ہے اور اہل علم کے ہاں معروف ومتداول ہے۔

دوسری کتاب ''کلمہ گو کی تکفیر'' ممتاز عرب عالم الدکتور شریف حاتم العونی کی تصنیف کردہ ہے جس کا اردو ترجمہ مفتی محمد بلال ابراہیم صاحب نے کیا تھا۔ کتاب ''ولاء وبراء'' کے اصول پر تکفیری نظریے کے پس منظر میں اور اس کے نقد کے طور پر لکھی گئی ہے۔ امام ابن تیمیہؒ اور سلفی علماء کے منہج فکر کی چھاپ نمایاں ہے اور بنیادی نکتہ یہی واضح کرنا ہے کہ تکفیر کا معاملہ کتنا نازک ہے اور اس میں کن کن اصولوں کی رعایت شرعاً وفقہاً لازم ہے۔

تیسری کتاب ''مسئلہ تکفیر ومتکلمین'' معاصر ہندوستانی صاحب قلم مفتی ذیشان احمد مصباحی صاحب نے اصولاً حنفی فقہی روایت کے تناظر میں لکھی ہے اور تکفیر سے متعلق اصولی واطلاقی مباحث کا مبسوط جائزہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ تکفیر سے متعلق معاصر رجحانات ونظریات پر بھی تبصرہ کرتی ہے۔

چوتھی اور سب سے مختصر کتاب ''تکفیر'' المورد پاکستان کے ریسرچ اسکالر رضوان اللہ صاحب کی تصنیف کردہ ہے۔ اس کا موضوع تکفیر سے متعلق جمہور علماء کے موقف اور جاوید احمد صاحب غامدی کے نقطہ نظر کا علمی موازنہ ہے۔ مصنف نے دونوں مواقف کے بنیادی استدلال کی وضاحت کرتے ہوئے عموماً غامدی صاحب کے موقف کی ترجیح بیان کی ہے، البتہ قادیانی جماعت کی تکفیر کے حوالے سے جمہور اہل علم کی تائید کی ہے۔

یوں یہ چار کتابیں اس مسئلے پر چار مختلف جہتوں اور زاویوں سے روشنی ڈالتی ہیں اور ان کے تقابلی مطالعے سے مسئلے کی اصولی واطلاقی پیچیدگیوں کا بہتر فہم حاصل کیا جاسکتا ہے۔

مسلمانانِ عالم کی موجودہ صورت حال اور اس کا تدارک

ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

شہرِ عزیمت غزہ میں دنیا کے کروڑوں مسلمانوں، ان کے اداروں، ان کی فوجوں، ان کے ممالک، او آئی سی وغیرہ کے ہوتے ہوئے بھی جو تباہی مچی ہے، معصوموں کا جو معصوم خون بہا ہے اس سے عام مسلمانوں اور خاص کر نوجوانوں کے جذبات بھڑکے ہوئے ہیں۔ ان کے دلوں میں اضطراب ہے، دماغوں میں بے چینی اور سوالوں کا طوفان بپا ہے۔ جذبات بھڑکنے بھی چاہییں مگر یہ دنیا جذبات کی بنیاد پر نہیں چل رہی۔ یہ اسباب کی دنیا ہے، علت و معلول کی دنیا ہے۔ اس لیے وسائل اور اسباب کو اختیار کرنا بے حد ضروری ہے، ہمارے دین کی تعلیم یہی ہے۔ اور اس سے پہلے یہ جاننا بھی بہت ضروری ہے کہ موجودہ دنیا میں ہم کہاں کھڑے ہیں اور ہمارا دشمن کہاں کھڑا ہے۔

نقاطِ قوت

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ جغرافیائی محلِ وقوع عالمِ اسلام کو اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ دنیا کو بحری تجارت کے لیے جن آبی گزرگاہوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ زیادہ مسلم ممالک سے ہو کر گزرتی ہیں۔ مثلاً بحرِ احمر اور مصر کا سوئز کینال وغیرہ۔

اسی طرح قدرتی ریسورسز (معدنیات، پیٹرول، گیس، سونے چاندی کے ذخیرے نیز rare minerals سے متعدد مسلم اور خاص کر عرب ممالک مالا مال ہیں اس لیے آج سعودی عرب ایک بہت بڑی اکانومی ہے۔ متحدہ عرب امارات نے اپنے جدید ترین انفرااسٹرکچر کے ذریعے اپنے آپ کو دنیا کا تجارتی سینٹر بنا دیا ہے جو اس کی اکانومی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ترکی، ملائیشیا اور انڈونیشیا نے ٹیکنالوجی میں خاصی ترقی کی ہے۔

نیز افرادی قوت (manpower)، مسلم ملکوں میں آبادی بہت ہے۔ ان میں سے کئی ملکوں کے پاس طاقتور افواج ہیں مثلاً ترکی، پاکستان، مصر اور ایران، الجزائر اور مراکش وغیرہ۔ حالیہ دنوں میں ایران پر طاغوتی قوتیں اسرائیل اور امریکہ دونوں حملہ آور ہوئیں جن کا مقابلہ اس نے پامردی سے کیا۔ پاکستان نے جواں مردی سے انڈیا کے ہندتوا کے بڑھتے قدم روکے۔

نقاطِ ضعف

اس سب کے ہوتے ہوئے بھی مسلمان امت دنیا میں اتنی بے وزن کیوں ہے؟ عالمی اداروں میں اس کی کوئی say (مؤثر آواز) کیوں نہیں ہے؟ یہ وہ سوال ہے جو بہتوں کو پریشان رکھتا ہے۔ اس چیز کو سمجھنے کے لیے ہمیں اپنے کمزوری کے پوائنٹس پر ایک نظر ڈالنی ہوگی۔ یہ نقاطِ ضعف داخلی و خارجی دونوں سطحوں پر ہیں اور اس طرح کے ہیں کہ ان سے صَرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا:

امت کا تصور عملاً ختم ہونا

سب سے پہلے تو امت کا تصور عملاً ختم ہو گیا ہے۔ اسلامی ادبیات میں اب بھی مسلم امہ کا ذکر خوب ہوتا ہے مگر اب وہ صرف ایک روحانی اور اخلاقی تصور بن کر رہ گیا ہے۔ اب مسلمان بھی عملاً چھوٹی چھوٹی قومیتوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ان قومیتوں اور ملکوں کے اپنے اپنے مفادات ہیں۔ سب سے پہلے سعودی عرب، سب سے پہلے پاکستان، سب سے پہلے مصر، سب سے پہلے ترکیہ، یہ مسلم دنیا کی عمومی صورت حال ہے۔ نیشن اسٹیٹ یا قومی ریاستوں کا یہ مظہر جدید سیاسی تصورات کی دین ہے اور اس کے عواقب بڑے خطرناک ہوئے ہیں، جن کو اہلِ نظر نے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا۔ اقبالؒ نے یوں ہی نہیں کہہ دیا تھا کہ

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیراہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

ایران پر امریکہ و اسرائیل کے حالیہ حملوں میں بھی مسلم دنیا کا رول مذمت کے بیانات سے آگے بڑھ کر کچھ سامنے نہیں آیا اور اس کی قابلِ رحم حالت پھر سب کے سامنے اجاگر ہوگئی۔

مسلم حکمرانوں اور بادشاہوں میں قوتِ ارادی کا فقدان

مسلمان حکمرانوں اور بادشاہوں کے پاس کوئی will power نہیں، ورنہ اگر یہ سب متحد ہو کر واقعی کوشش کرتے تو غزہ میں جاری فلسطینی مسلمانوں کا قتلِ عام روک سکتے تھے۔ مگر تلخ صورتِ حال یہ ہے کہ شروع میں تو حرم میں غزہ کے لیے دعا بھی منع تھی اور غزہ کا نام لینے پر گرفتار کر لیا جاتا تھا، اب ہلکی پھلکی دعا کی اجازت ہے جس سے اسرائیل اور امریکہ کے ماتھے پر کوئی شکن نہ آئے۔ اس سے بھی زیادہ شقاوت اور بے حسی کی انتہا یہ کہ سعودی عرب کے جدہ اور ریاض میں برابر امریکی رقاصہ جینیفر لوپیز کے عریاں کنسرٹ حکومت کی سرپرستی میں کرائے جاتے رہے اور اب بھی یہ مکروہ سلسلہ جاری ہے۔

اس بارے میں علماء کرام اور دینی جماعتوں کے ذمہ داران نے بھی اپنا شدید احتجاج درج نہیں کرایا۔ مسلمان علماء و دانشور، صحافی، سیاست داں اور عوام اتنی بڑی تعداد میں باہر نکل کر نہیں آئے کہ وہ اپنی حکومتوں اور اپنی آرمی پر کوئی دباؤ بنا سکتے۔ اپنی پارلیمنٹوں سے اسرائیل کو دہشت گرد ریاست قرار دلوا سکتے۔ اگر وہ ایسا کر لیتے تو شاید مغربی قوتیں ان کا کچھ تو نوٹس لینے پر مجبور ہوتیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ پاکستان، ہند اور بنگلادیش کے وہ علماء جو ملوکیت کے خادم اداروں کے ممبر بنے ہوئے ہیں وہ ان سے استعفاء دیں گے۔ کیونکہ قلبِ اسلام میں سرکاری سرپرستی میں جن فواحش کو رواج دیا رہا ہے ان کی موجودگی میں ایسی ممبرشپ کو قبول کیے رہنے کا کوئی جواز ہماری نظر میں نہیں ہے۔

افسوس کہ یہ تمام مسلم حکمران ایران اور یمن کے مجاہد حوثیوں کو چھوڑ کر اسرائیل کو ایک حقیقتِ واقعہ سمجھ کر قبول کر چکے ہیں۔ اس حقیقت کو بھی مزاحمتی قوتوں کو سامنے رکھنا چاہیے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ عرب ممالک کا کردار حکیمانہ ہے کیونکہ وہ پوزیشن میں بالکل نہیں ہیں کہ مغرب سے کوئی تصادم مول سکیں۔ اور اسرائیل سے جنگ کرنے کا مطلب اصل میں امریکہ سے جنگ کرنا ہے۔ یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے کہ اسرائیل دراصل مغرب کی استعماری چوکی ہے اور اس کے سلسلہ میں مغرب کوئی سمجھوتہ نہیں کرتا۔ تاہم عرب اور اسلامی ممالک کا موقف حکیمانہ بالکل نہیں رہا بلکہ بزدلانہ اور مجرمانہ رہا۔ اس کو حکیمانہ اس وقت کہا جا سکتا تھا جب وہ غزہ میں معصوم جانوں کو بچانے کے لیے عملاً کچھ کرتے۔ اسرائیل کی جارحیت رکواتے، وہاں انسانی امداد داخل ہونے دیتے اور غزہ کی ظالمانہ ناکہ بندی ختم کرواتے۔ جن لوگوں کو رات دن ذبح کیا جا رہا ہو اور بموں سے زندہ جلایا جا رہا ہو ان کے لواحقین کو آپ مفت میں حج و عمرہ کرا کر اپنی ذمہ داری سے نہیں بچ سکتے! اگرچہ حکومتی سطح پر سعودی عرب کا حالیہ موقف بہتر ہے کہ اُس نے علی الاعلان کہا ہے کہ ہم اسرائیل کو تبھی تسلیم کریں گے جب وہ دو ریاستی حل کو مان کر فلسطین کے قیام کے لیے راضی ہو جس کا دارالحکومت قدس ہوگا۔ اس کے علاوہ ریاستی سطح پر سعودی عرب کا نمائندہ اسرائیل کے خلاف عالمی عدالتِ انصاف میں بھی پیش ہوا۔

مسلم خصوصاً عرب حکمرانوں کا فدویانہ طرزِ عمل

مسلم حکمرانوں اور امراء کی سوچ اور خاص کر عرب حاکموں کی اپنے عوام سے کس قدر دور ہے؟ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ دو ماہ قبل چودہ مئی کو امریکی صدر ٹرمپ سعودی عرب اور قطر اور امارات کے دورے پر تھے۔ اس دورے میں عرب حکمرانوں نے جس طرح ان کا شاہانہ استقبال کیا، جس طرح ملینوں ڈالر کا طیارہ قطر نے ان کو تحفہ میں دیا۔ جس طرح تینوں ملکوں نے اربوں کے ہتھیار امریکہ سے خریدنے کے معاہدے سائن کیے۔ وہ اپنے آپ میں شرمناک ہے۔ ساتھ ہی یہ لوگ اپنے فدویانہ جذبہ سے مغلوب ٹرمپ سے غزہ میں اسرائیلی جارحیت رکوانے کے بارے میں کوئی بات نہیں کہہ سکے۔ الٹے ٹرمپ نے ان کو غزہ کا نام لے کر وہاں سے ہو رہی اسرائیل کے خلاف مزاحمت/نام نہاد دہشت گردی کو لے کر ان کو لیکچر دیا۔ ٹرمپ نے طوطے کی طرح اسرائیلی بیانیہ دہرا دیا اور ان سننے والے جلالۃ الملوک میں سے کسی نے بھی اتنا حوصلہ نہیں دکھایا کہ تصویر کا دوسرا رخ یعنی عرب سائیڈ آف اسٹوری ہی ٹرمپ کے سامنے رکھی جاتی۔

مزاحمتی قوتوں کو یہ تلخ حقیقت اپنے سامنے رکھنی چاہیے کہ ان کا بیانیہ نہ صرف غیروں بلکہ اپنوں میں بھی نہیں چل پا رہا ہے۔ ٹرمپ نے ریاض میں جی سی سی ممالک کے حکمرانوں اور ان کے مندوبین کے سامنے حکمرانوں پر تعریفوں کے ڈونگرے تو برسائے۔ محمد بن سلمان کو کہا کہ "تم اتنا کام کرتے ہو، سوتے ہو یا نہیں؟ تم لوگوں نے تو مشرق وسطیٰ میں بالکل انقلاب برپا کر دیا ہے۔ اتنی بڑی بڑی بلڈنگیں، یہ اسکائی اسکریپر! واہ واہ کیا بات ہے! جائی کھڑے ہو جاؤ"۔ اور اس حکم پر نہ صرف بن سلمان بلکہ اس کی حکومت کے تمام کارندے اور سارے خلیج کے مندوبین کمال نیازمندی سے کھڑے ہو گئے!

ٹرمپ کے اس دورے نے ایک بار پھر ہمارے سامنے اس حقیقت کو ننگا کر دیا کہ یہ حکمران مالدار اور کھرب پتی سہی لیکن اپنی کمزوری میں یہ صحیح معنی میں مضبوط حکمران نہیں بلکہ صرف اور صرف ملوک الطوائف ہیں اور

اندلس کے ملوک الطوائف کی طرح ہی بے غیرت اور بے حس بھی ہیں اور بے حوصلہ بھی۔ ٹرمپ کے حالیہ دورۂ مشرق وسطیٰ میں یو اے ای نے دوشیزاؤں کے hair splitting dance کے ذریعہ امریکی ڈکٹیٹر کے استقبال سے مسلم ثقافت کو شرمسار کیا۔ تینوں ممالک نے اپنی اپنی کرسی کی حفاظت کے بدلے 1.4 ٹریلین ڈالر کے سودے کیے۔ قطر نے تو تملق کی حد کر دی کہ 400 ملین ڈالر کا جیٹ طیارہ ٹرمپ کو گفٹ کیا۔ یہ قومی خزانے قوم سے پوچھ کر خرچ نہیں کیے گئے، ان کا کوئی حساب لینے والا بھی نہیں۔ یہی فرق ہوتا ہے شخصی حکومتوں اور جمہوریت میں۔ یہ قومی خزانے اس پورے خطے کی قسمت بدل سکتے تھے اگر ان کو قوم کی فلاح و بہبود کے لیے، سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے اور عالم عرب کی عام اٹھان کے لیے ایمانداری سے خرچ کیا جاتا۔

اس موقع پر منعقدہ ہوئے جی سی سی ممالک کے ہائر رینک اجلاس میں گرچہ کئی حکمرانوں نے دبے لفظوں میں غزہ کی بات کی، جبکہ ٹرمپ نے اس عرب سخاوت و مہمان نوازی کا بھی کوئی لحاظ نہ کر کے دوحہ میں صاف کہہ دیا کہ غزہ میں آئی مصیبت کی ذمہ دار حماس ہے اس کو ہتھیار ڈالنے ہوں گے اور تمام اسرائیلی یرغمالیوں کو رہا کرنا ہوگا۔ جس وقت ٹرمپ اس ٹور پر تھے اسرائیل تابڑ توڑ زمین سے، فضا سے اور سمندر سے حملے کر کے دو سو فلسطینیوں کا قتل عام کر رہا تھا، جس پر کسی بھی مغربی ملک سے کوئی مذمت کا بیان جاری ہوا نہ عرب حکمرانوں کی طرف سے۔

ٹرمپ کے دورۂ شرقِ اوسط سے قبل ہی حماس نے امریکہ سے مذاکرات کے نتیجہ میں یکطرفہ اور خیر سگالی کے اشارہ کے طور پر دوہری شہریت کے حامل نوجوان امریکی فوجی یرغمالی عیدان الیگزینڈر کو رہا کر دیا۔ اور جیسا کہ طے پایا تھا امید تھی کہ اس کے بدلے میں غزہ میں انسانی امداد کو آنے دیا جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ٹرمپ بھلے ہی اسرائیل نہ آیا ہو مگر اس کی انتظامیہ پورے طور پر بنجمن نتن یاہو کے ساتھ ہی کھڑی ہے۔ اور اس میں ٹرمپ میں اختلافات کی کہانی محض ایک افواہ ہے۔

امریکی مندوب اسٹیو وٹکوف بھی اسرائیل کی بولی ہی بولتا رہا کہ حماس کو غزہ میں رہنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ وٹکوف کو معلوم ہو گیا ہے کہ بنجمن نتن یاہو (یاد رہے کہ بائبل میں بن یامین کو پھاڑ کھانے والا بھیڑیا کہا گیا ہے، جینیسس باب 49:27) کسی پریشر میں آنے والا نہیں ہے اور ٹرمپ اس پر براہ راست کوئی پریشر ڈالنے کا خطرہ مول بھی نہیں لے گا۔

اگر عرب زعماء اپنے خزانوں کو اتنی سخاوت سے ٹرمپ پر نثار کرنے کے بدلے کچھ جرأت کا مظاہرہ بھی کر پاتے تو شاید ٹرمپ اس بارے میں کچھ سوچ سکتا مگر وہ غریب تو شاہ سے زیادہ کون شاہ کا بڑا وفادار ہے، اور کون بڑا خوشامدی ہے، یہ ثابت کرنے کی دوڑ میں لگے ہوئے تھے! اس دورے سے امریکی انتظامیہ کو اس بات کا پورا اندازہ ہو چکا ہے کہ غزہ غریب تو کہیں مالدار عرب ریاستوں کے ایجنڈے میں آتا ہی نہیں۔ وہ اپنے بیانوں اور تقریروں میں اس کے بارے میں جو ایک آدھ لفظ بول دیتے ہیں تو وہ صرف اپنے عوام کو ٹھنڈا کرنے کے لیے!

ٹرمپ کے حالیہ دورے سے تھوڑا سا فائدہ یہ ضرور ہوا کہ سعودی عرب کی سفارتی محنت سے امریکہ نے شام کی نئی سُنی حکومت کو تسلیم کر لیا اور اس پر سے اقتصادی پابندیاں ختم کرنے کا اعلان کیا۔ ان پابندیوں نے شام کی اقتصادیات کو بالکل توڑ دیا تھا۔ ٹرمپ کے دورہ کے ختم ہوتے ہی عرب لیگ کا چوتنتیسواں اجلاس عراق میں ہوا، بڑی گرم گرم اور جوشیلی تقریریں ہوئیں، بیانات دیے گئے مگر گراؤنڈ پر کچھ بھی بدلنے میں بالکل ناکام۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ عرب لیڈروں اور حکمرانوں نے جو ادارے اور تنظیمیں بنائی ہیں ان میں بھی کوئی مؤثر ادارہ نہیں، او آئی سی، رابطہ عالم اسلامی، عرب لیگ سب غیر مؤثر ہیں۔ سب پر سعودی عرب اس لیے اثر انداز ہے کہ سب کی فنڈنگ وہی کرتا ہے۔

مسلمانوں میں انتشار اور عدمِ اتحاد

اسی کی ایک کڑی مسلمانوں میں انتشار اور عدمِ اتحاد کی کیفیت ہے۔ شیعہ سنی اختلاف تو اپنی جگہ، خود سنی باہم متحارب ہیں۔ عرب ممالک عراق، سیریا، لیبیا، سوڈان وغیرہ میں قبائلی گروہ باہم برسرپیکار ہیں اور اس داخلی خانہ جنگی سے نہ صرف عوام تباہ ہو رہے ہیں، قومی املاک برباد ہو رہی ہیں، بلکہ غیر ملکی قوتوں کو براہ مداخلت کا سنہرا موقع مل رہا ہے۔ مسلمان سیاسی قیادت اور خاص کر عرب قیادت کسی پلیٹ فارم پر اکٹھا ہو جاتی ہے تو وہیں ان کے باہمی گلے شکوے شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے، اور یہ منظر عرب لیگ کے ہر اجلاس میں نظر آجاتا ہے۔ حال ہی میں 18 مئی 2025ء کو جو اجلاس ہوا اس میں بھی نظر آگیا کہ بن سلمان اور بن زاید تو وہاں گئے ہی نہیں، امیر تمیم بھی اجلاس میں بغیر شریک ہوئے واپس آگئے۔

مسلم دنیا کے تین بلاک

مسلم ممالک کے عملاً تین بلاک بن گئے ہیں: ایران، سعودی عرب اور ترکی۔ تینوں کے مفادات متصادم ہیں۔

۱. سعودی عرب اور اس کے ساتھ دوسرے خلیجی ممالک یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ اسرائیل کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی آپشن نہیں، یہ حماس کو بھی own نہیں کرتے (اس کو اپنا نہیں سمجھتے)۔

۲. ترکی صرف زبانی جمع خرچ کرتا ہے عملاً کچھ نہیں کرتا۔

۳۔ ایران اور یمن کے حوثی مقابلہ کر رہے ہیں مگر کمزور ہیں۔

کل ملا کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ طاقت کا توازن مسلمانوں کے حق میں بالکل بھی نہیں ہے۔ آج تعلیم، سائنس اور اقتصادیات تینوں میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جو فرق ہے وہ سو دو سو سال کا نہیں صدیوں کا ہے۔ پہلے اس کو دور کرنا ہوگا۔ ہم عرب حکمرانوں کی مذمت اکثر کرتے ہیں مگر سچی بات تو یہ ہے کہ خلیج کے عرب ہوں یا عجم کے مسلم حکمران، اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ ترکی، پاکستان، ملائیشیا، انڈونیشیا، آذربائیجان اور مصر وغیرہ، شکوہ تو سب سے ہے، عرب چونکہ قریبی ہیں اور مالی وسائل بھی دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ رکھتے ہیں اس لیے ان کا ذکر زیادہ آجاتا ہے۔

حماس کی مذمت اور حمایت سے دستبرداری

بعض لوگوں کا خیال ہے، جس کو عرب میڈیا میں خلیج کے حکمرانوں کے گماشتے بڑے پیمانے پر پھیلا رہے ہیں، کہ فی الحال حماس کے پاس اور کوئی آپشن نہیں بچا ہے سوائے اس کے کہ وہ غزہ کو اس وقت چھوڑ دے اور دوبارہ اپنی صفوں کو دوسرے نام سے متحد کرے، آخر کو حضرت سیف اللہ خالد بن الولیدؓ جنگِ موتہ میں اپنے تین ہزار مجاہدین کو ایک لاکھ کے ٹڈی دل رومی لشکر کے نرغہ سے نکال لے گئے تھے، اور مدینہ میں بعض لوگوں نے جب ان کو ''فرارون'' کے طعنے دیے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعریف فرمائی اور کہا ''بل الکرارون'' یعنی یہ بھاگے نہیں بلکہ دوبارہ تازہ دم ہو کر حملہ کریں گے۔

لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اگر مزاحمت و مقاومہ آج ختم ہو جائے اور حماس سرنڈر کر دے تو کل سے ہی اسرائیل فلسطینیوں کی جبری نقل مکانی شروع کر دے گا۔ امریکہ اس جرم میں اس کے ساتھ شریک ہو جائے گا۔ عرب ممالک تھوڑا بہت شور مچا کر خاموش ہو جائیں گے، بقیہ مسلم و غیر مسلم ممالک نام نہاد عالمی برادری اور عالمی اداروں کی دہائی دیں گے۔ جبکہ غزہ کے المیہ نے مسلسل یہ ثابت کر دیا ہے کہ نہ تو عالمی برادری ہی کہیں موجود ہے اور نہ کوئی عالمی ادارہ حقیقت میں باقی بچا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اسرائیلی لیڈروں کے خلاف گرفتاری کا وارنٹ جاری کرنے والی عالمی عدالت کے چاروں ججوں پر امریکہ بہادر پابندی عائد کر چکا ہے۔ یو این او کے ان ذمہ داران کو بھی امریکہ سزا دے رہا ہے جو اپنے ضمیر کا سودا نہیں کرتے۔ اقوام متحدہ مذمتی بیانات پر اکتفا کرے گی اور مسئلہ فلسطین ہمیشہ کے لیے مٹی میں دفن ہو جائے گا۔ اس خطرناک مجرمانہ پلان کے راستہ میں صرف مزاحمت ہی حائل ہے۔ اس لیے ہر ممکن جانی و مالی قربانیوں کے ساتھ مزاحمت جاری رہنی چاہیے۔ اس کے علاوہ کوئی آپشن مزاحمتی تنظیموں اور اہلِ غزہ اور اہلِ فلسطین کے پاس نہیں ہے۔

علم و تحقیق میں انحطاط اور اندھی تقلید

مسلم دنیا میں کوئی نئی تحقیق نہیں ہوتی، بزرگوں کی اندھی تقلید ہے، اجتہاد فی الفکر نہیں، عمومی رویہ جمود و تقلید کا ہے۔ جبکہ حقیقت کی دنیا میں ایسا ممکن نہیں ہوتا کہ آپ دینی معاملات میں اندھے مقلد ہوں اور دنیاوی علوم میں ترقی کر کے دکھا دیں، اجتہاد کریں اور نئی نئی ایجادات کریں۔ اس لیے علماء کا یہ عذر، عذرِ لنگ ہے کہ دین کو ہمارے اوپر چھوڑیں اور دنیاوی معاملات میں اجتہاد کریں کس نے روکا ہے؟ یہ صحیح ہے کہ زیادہ ذمہ داری حکومتوں کی ہے مگر علماء و دانشور بھی بری الذمہ نہیں کہے جا سکتے۔ انسان کی زندگی خانوں میں نہیں بٹی کہ ایک خانہ میں آپ بالکل اندھی تقلید کریں اور دوسرے خانہ میں آپ کا ذہن جدت سے کام لے اور اجتہاد کر سکے، ایسا نہیں ہوتا۔ دونوں ہی خانوں میں آپ کو نئی فضا بنانی ہوگی۔ علمی تحقیق کا راستہ کھولنا ہوگا، آزادئ رائے کا احترام کرنا ہوگا، اختلاف کو برداشت کرنا ہوگا، سب کو مواقع دینے ہوں گے تب جا کر آپ کا ذہن فعال ہوگا اور مثبت کام کرے گا۔ ذہین لوگ مسلم ممالک سے نکل نکل کر کیوں مغرب جا رہے ہیں؟ brain drain کیوں ہو رہا ہے اس پر سوچنا ہوگا۔

سائنس و ٹیکنالوجی میں پیچھے رہ جانا

ایک تحقیق کے مطابق گزشتہ چالیس پچاس سال میں جتنے نوبل پرائز دیے گئے ہیں وہ یہودی اسکالروں اور سائنس دانوں نے حاصل کیے ہیں۔ مسلمانوں نے جو انعامات حاصل بھی کیے ہیں ان کا تعلق بھی چند کو چھوڑ کر ادب، حقوقِ انسانی سے ہے یا امن ایکٹوزم سے، سائنس و ٹیکنالوجی سے نہیں۔ تاہم نوبل انعام کے بارے میں بہت سے مسلمانوں کو شک و شبہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہاں تعصب برتا جاتا ہے۔ مان لیا، لیکن سوال تو یہ ہے کہ فیصل ایوارڈ میں بھی مسلمان عموماً خدمتِ اسلام، عربی ادب اور حدیث یا فقہ وغیرہ میں خدمات پر یہ انعام حاصل کرتے ہیں۔ طب، سائنس و ٹیکنالوجی اور مصنوعی ذہانت وغیرہ میں حاصل نہیں کر پاتے!

علماء کرام کہتے ہیں کہ ہم نے تو کبھی قوم کو سائنس و ٹیکنالوجی میں آگے بڑھنے سے منع نہیں کیا۔ یہ بات درست ہے مگر یہ آدھا سچ ہے۔ آپ نے کبھی منع نہیں کیا تو کبھی قوم کو اس کی جانب شدت سے راغب بھی نہیں کیا۔ آپ کے ہاں سیکولر اور دنیاوی علوم کو ہمیشہ ثانوی درجہ دیا گیا۔ اس کے بجائے مسلمان اہلِ علم و اہلِ دانش اسلامائزیشن آف نالج جیسے غیر مفید مشغلوں میں لگ گئے۔ بلکہ آپ کے ہاں ایسی کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں: فوز مبین در رد حرکت زمین، اور ایسے علماء کی فالوونگ عام مسلمانوں میں بہت زیادہ ہے۔ برصغیر کی بات کریں تو آپ نے اپنے مدارس میں آج تک معمولی سی لیپا پوتی کرنے کے علاوہ کوئی انقلابی تبدیلی نصابوں میں نہیں کرنے دی۔ ماضی قریب میں ترکی کے شیخ الاسلام نے عثمانی مملکت کو نئی ٹیکنیک اختیار

کرنے سے روکا تھا، اس کا کیا جواز تھا؟ اس کی اور بھی تلخ مثالیں موجود ہیں۔

یہودیوں اور اسرائیل سے یہ سبق سیکھنے کی ضرورت ہے کہ انہوں نے ترقی یافتہ ملکوں میں بہتر مواقع اور بہترین زندگی اور عیش و آرام کو چھوڑ کر سو سال پہلے فلسطین میں زمینیں خرید کر وہاں بنجر زمینوں کو آباد کیا، بڑی محنت کی اور اپنی زرعی و تجارتی کالونیاں بنائیں، تعلیم گاہیں قائم کیں، اپنی ملیشیائیں بنائیں، اور اپنی اسرائیلی قومیت کے لیے رات دن کام کیا۔ اپنی مردہ ہو چکی عبرانی زبان کو ایک زندہ زبان میں بدل دیا۔ جب فلسطین کا ایک خطہ یونائیٹڈ نیشنز اور یونائیٹڈ کنگڈم کی ملی بھگت سے ان کو مل گیا تو اس کو ہر اعتبار سے ترقی یافتہ اور کامیاب ملک بنا دیا۔ سائنس و ٹیکنالوجی اور عسکری قوت میں اتنا آگے اسے لے گئے کہ آج اس خطہ میں یہ چھوٹا سا ملک ناقابلِ تسخیر مانا جاتا ہے اور تمام عرب ملکوں پر فوقیت رکھتا ہے۔

یہودیوں کی اس اجتماعی کوشش کا مقابلہ مسلمانوں کی تحریکات سے کریں تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں میں کسی مقصد کے لیے مسلسل ایکٹو (متحرک) رہنے کی روایت نہیں ہے، وہ جوش و خروش کے ساتھ وقتی طور پر اٹھتے ہیں اور پانی کے بلبلے کی طرح جلد ہی بیٹھ جاتے ہیں۔ جھٹ پٹ گوریلا کارروائیوں سے، جن میں عام انسان بھی مارے جاتے ہیں، اب الٹے نتائج نکل رہے ہیں، جیسے کہ حماس کا سات اکتوبر کا حملہ طوفان الاقصیٰ کا ونٹر پروڈکٹو ثابت ہوا۔ ایسے ہی دنیا میں اور مقامات پر ہونے والے واقعات۔ اس طرح کے واقعات کو ہمیشہ ہی مخالف قوتیں دوسرا رنگ دے کر دہشت گردی (terrorism) قرار دے دیتی ہیں جس کے خلاف اب ایک عالمی اجماع بن چکا ہے۔ دنیا کے اس اجتماعی فیصلہ کے خلاف جانے کے نتائج بڑے سنگین ہوتے ہیں خصوصاً اس صورت میں جبکہ آپ کے ساتھ کوئی طاقت نہ کھڑی ہو۔ افغانستان کا جہاد روس کے خلاف اس لیے کامیاب ہوا کہ اس میں امریکہ پوری طرح مجاہدین کی پشت پر کھڑا تھا اور ریاست پاکستان بڑا رول ادا کر رہی تھی۔ اور جس جگہ کسی قوت کا ساتھ نہ ہو تو پھر نتیجہ وہی ہوتا ہے جو غزہ کی تباہی کی صورت میں ساری دنیا کے سامنے ہے۔

بغیر تیاری کے میدان میں کود پڑنا

گزشتہ دو سو سال کی تاریخ امتِ مسلمہ کی پسپائی اور شکست و ہزیمت کی تاریخ ہے جو سید احمد شہیدؒ کی تحریک سے شروع ہوتی ہے اور آج تک چلی آتی ہے۔ امیر عبدالقادر الجزائریؒ، امام شاملؒ، عمر مختار سنوسیؒ اور اب فلسطین کا جہادِ آزادی سب کی کہانی ایک جیسی ہے۔ یہاں ایک بار پھر اقبال رہبری کرتے ہیں۔

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب
تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے
سوئے گردوں نالۂ شب گیر کا بھیجے سفیر
رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے
یہ گھڑی محشر کی ہے، تُو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل، عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!

صہیونیت اور ہندوتوا کا اثر و رسوخ

عالمی سطح پر دو بڑی لابیاں ہیں: صہیونی، ہندوتوا۔ صہیونی تو دنیا پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ ہندوتوا کے لوگ بھی اتنے مضبوط ہو گئے ہیں کہ RSS ہندوستان میں حکمراں ہے اور مغرب میں بھی سرگرم ہے۔ ٹرمپ حکومت میں اس وقت اوشا وینس، اور تلسی گبارڈ بڑے عہدوں پر ہیں۔ آخر الذکر اسلاموفوبیا سے متاثر ہے اور ہندوتوا لابی سے بہت قریب۔

ان دونوں لابیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے پاس صرف جذبات ہیں اور کوئی عملی لائحہ عمل نہیں۔ مثال کے طور پر امریکہ کی بات کریں تو وہاں جنوب ایشیا کے مسلمانوں کی کوئی لابی نہیں۔ یہ لوگ وہاں صرف اپنے آبائی ملکوں کی سیاست میں دل چسپی رکھتے ہیں۔ پاکستانی ڈائسپورا (نژاد) کے لوگ پی ٹی آئی اور مسلم لیگ نون کے درمیان جھولتے رہتے ہیں۔ البتہ فلسطینی ڈائسپورا، اساتذہ، اسٹوڈنٹ وغیرہ سرگرم رہے ہیں اور ان کی وجہ سے ہی اب رائے عامہ میں فلسطین کے لیے آواز بلند ہوئی اور لوگ سڑکوں پر نکل کر آتے رہے۔

شرک و بدعت کی اندرونی صورتحال

اندرونی طور پر مسلمان امت شرک و بدعات میں بری طرح گرفتار ہے۔ جس کا شکوہ حالی نے مسدس میں بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر
جھکے آگ پر بہرِ سجدہ تو کافر
جو ٹھیرائے بیٹا خدا کا تو کافر
کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں
اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں

مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں
شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے
ہمیشہ سے اسلام تھا جس پہ نازاں
وہ دولت بھی کھو بیٹھے آخر مسلماں

یہ شرک و بدعات اور توہمات مسلمانوں میں غیر اسلامی تصوف کی بدولت آئے ہیں۔ کچھ کمزور اور موضوع روایات کی جہت سے آئے ہیں مگر بڑا سورس تصوف ہی ہے۔ تصوف کے کچھ ضمنی فائدے ہوتے ہیں تزکیۂ نفس، تربیتِ ذات اور عبادتِ الٰہی کی مشق وغیرہ۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ چیزوں کی حقیقت سے بحث کرتا اور گہرے مسائل پر غور کرنا سکھاتا ہے۔ مگر مجموعی طور پر تصوف سے مسلمانوں کو دو بڑے نقصان ہوئے ہیں: ایک تو بزرگوں کی اندھی عقیدت اور شخصیت پرستی، تصورِ شیخ، وحدت الوجود جیسے مشرکانہ خیالات نے توحید کی مٹی پلید کر دی۔ دوسرے علم سے مسلمانوں کو روکا کیونکہ تصوف کی روایت میں ایک عام تصور کتاب دشمنی کا رہا ہے۔ یہاں ارشادِ شیخ ہی اصل ہے اور مسترشدین کو یہ سکھایا جاتا تھا کہ: صد کتاب و صد ورق در نار کن (کتاب و اوراقِ کتاب وغیرہ کو آگ میں پھینک دو) یہ تصوف کا عام مزاج ہے۔ اس میں استثناء بھی ملتا ہے اور بہت سے صوفیاء نے علم کی آبیاری کی ہے۔ مثال کے طور پر شاہ کلیم اللہ جہان آبادی کے خانوادہ میں ریاضیات کا چرچا رہا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کا خانوادہ اسلامی علوم میں سرخیل رہا وغیرہ۔

بظاہر ہماری یہ بات بے محل سی معلوم ہوتی ہے مگر گزشتہ دو سو سال کی ملی تاریخ پر غور و فکر سے ہمارے ناقص خیال میں یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ امتِ مسلمہ من حیث المجموع توحید کو چھوڑنے کے نتیجہ میں ایک عمومی عتاب و عذاب کا شکار ہے جسے حدیث میں قہر الرجال و غلبۃ الدین سے سلامتی کی دعا میں اشارہ کر دیا گیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ دنیا کی سیاسی قیادت اور عالمی معیشت کی سیادت ان کے ہاتھ سے چھین لی گئی ہے۔ اور یہ چیز دوبارہ حاصل نہیں ہو سکتی، مگر توحید کے پرچم کو پھر سے مضبوطی سے تھامنے سے۔

اصلاحِ حال

اصلاحِ حال کے سلسلہ میں بھی تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے، تاہم یہ مضمون پہلے ہی طویل ہو گیا ہے اس لیے تفصیل کو کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں اور اشارات پر اکتفاء کرتے ہوئے مختصراً کہیں گے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے اس امت کی خصوصی ترکیب یعنی بقول اقبال "خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی" کو سامنے رکھ کر یہ حکیمانہ جملہ کہا تھا: "لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا" کہ اس امت کی اصلاح اسی طریقہ سے ہو گی جس سے پہلے ہوئی تھی۔

رجوع الی القرآن

مسلمان امت کے لیے اصل لائحہ عمل صرف یہی ہے کہ وہ بحیثیت مجموعی اپنی لگام قرآن کے ہاتھوں میں دے دے۔ قرآن ہی اس کے ہر درد کا درماں اور ہر بیماری کا علاج ہے۔ افسوس کہ مسلمانوں میں آج بھی ایسے پیر فقیر اور مولوی ملا موجود ہیں جو مسلمانوں کو قرآن سے رجوع کرنے کو برا جانتے ہیں۔ یہ لوگوں کو ترجمۂ قرآن پڑھنے سے منع کرتے اور مسجدوں میں درسِ قرآن سے روکتے ہیں، اس عذرِ لنگ کے ساتھ کہ براہ راست قرآن کے معنی پڑھیں گے تو گمراہ ہو جائیں گے۔ وہ اسلاف کو بھول گئے ہیں جن کے بارے میں اقبال نے کہا کہ

وہ زمانہ میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اقبالؒ کی تعلیم یہی ہے کہ قرآن کے بغیر مسلمانوں کی زندگی نہیں۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن

مسلم ممالک کا دفاعی اتحاد

دوسرے اب تک کے تجربات نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ او آئی سی اور عرب لیگ جیسے کاغذی شیر اور صرف بیان داغنے والے ادارے کسی حقیقی مقصد کو پورا نہیں کرتے۔ حقیقت کی دنیا میں مسلم دنیا کو آکرناٹو کی طرز پر ایک ایسا دفاعی بلاک تشکیل دینا چاہیے جس میں کسی بھی رکن ملک پر جارحیت کو پورے بلاک پر جارحیت تسلیم کیا جائے۔ تمام مسلم ممالک کو ایران کی تقلید کرتے ہوئے مغرب کی دفاعی چھتری کے سراب سے باہر آکر خود اپنا دفاع کرنے کی پالیسی اختیار کرنی چاہیے، جب تک وہ ایسا نہیں کریں گے عالمی سطح پر ان کی بے حیثیتی دور نہیں ہو سکتی۔

طویل المدت تعلیمی منصوبہ بندی

تیسری چیز یہ ہے کہ اصلاحِ حال کا کوئی شارٹ کٹ نہیں، طویل المدت منصوبہ بندی، تعلیم اور صرف تعلیم کا منصوبہ اختیار کرنا ہو گا۔ اس کے علاوہ مسلم دنیا سائنس و ٹیکنالوجی اور اب مصنوعی ذہانت کے میدان میں زیادہ سے زیادہ آگے بڑھے۔ سیاسی طور پر مسلمانوں کو جمہوری طرزِ حکومت کو عموماً اپنا لینا چاہیے جس میں موقع و محل کے اعتبار سے مناسب تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں۔ مگر ملوکیت، فوجی ڈکٹیٹر شپ اور آمریت کو مسلم معاشروں میں اب مزید برداشت نہیں کیا جانا چاہیے۔ ایک عام تحریک اٹھے جو مسلم امت میں

سے ان لعنتوں کا خاتمہ کرے۔ علماء اور دانشور مزید متحرک ہوں وہ ملوکیت کے بندے، مفادات کے اسیر نہ بنیں۔ بدعات خرافات اور توہمات کے خلاف مہم چلائی جائے۔ مسلمانوں میں اتحاد واتفاق پیدا کیا جائے، حکمرانوں اور امراء پر پریشر بنایا جائے۔ ایسے سیاسی اور اقتصادی پریشر گروپ تیار کیے جائیں جو دنیا پر اثرانداز ہو سکیں۔

امت کے نفع ونقصان کا شعور

چوتھے شعور کی بیداری عام مسلمانوں میں بہت ضروری ہے۔ مسلمانوں اور ان کے ساتھ ہی گلوبل ساؤتھ (ترقی پذیر دنیا) کو یہ سوچنا چاہیے کہ ان کو اب بھی اسی ظالمانہ اور مستکبرانہ مغربی سرمایہ دارانہ ورلڈ آرڈر کے تحت رہنا ہے یا متبادل طریقے ڈھونڈنے چاہییں؟ افسوس کہ عالمِ عرب میں کوئی ایک بڑی آواز ہمیں ایسی سنائی نہیں دیتی جو اس پر اپنے لوگوں کو غور کی دعوت دیتی ہو۔ وہاں تو اب بھی شیعہ سنی فرقہ وارانہ کھیل ہی جاری ہے۔ جبکہ غیر مسلم ممالک جیسے برازیل، کیوبا، نارتھ کوریا سے ایسی آوازیں اٹھ رہی ہیں اور برکس کے ممبران چین کے ساتھ مل کر ڈالر کو چیلنج دینے کا عندیہ ظاہر کر چکے ہیں۔

مسئلہ فلسطین

فلسطین کے لیے ایک عالمی عوامی تحریک برپا کی جائے جو پرامن ہو اور تمام جدید وسائل کے ساتھ دنیا کے لوگوں تک اپنا جائز موقف رکھے۔ یہ تحریک اپنے آپ دنیا بھر کے طلبہ نے چھیڑ دی ہے بس اس کو صحیح رخ دیتے رہنے کی ضرورت ہے۔ مزاحمتی تحریکوں کو اپنی اسٹریٹیجی بدلنی ہوگی۔ ذہن میں یہ بھی آتا ہے کہ اگر یہ یہی مسلح مزاحمت خود اسرائیل کے اندر شروع ہوئی ہوتی تو شاید اس کا انجام یہ نہ ہوتا یعنی اسرائیل غزہ کو اس طرح تہس نہس نہ کر پاتا۔ اسی طرح خود فلسطینیوں کو بھی اپنی صفوں کو یکجا کرنا ضروری ہے۔ مقام افسوس ہے کہ انہوں نے من حیث القوم اپنی خون آلود تاریخ سے کما حقہ سبق نہیں سیکھا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جب انگریز مینڈیٹ وہاں سے اپنا بوریا بستر سمیٹ رہا تھا اور اُس نے صہیونی دہشت گردوں کو فوجی طور پر کیل کانٹے سے لیس کر دیا تھا۔ ان کی دہشت گرد تنظیموں کی افرادی قوت ساٹھ ہزار تک تھی جس کے پاس ہر طرح کے ہتھیار اور فوجی تربیت تھی۔ وہ فلسطینیوں کے گاؤں اور بستیوں پر منظم حملے کرتے تھے مگر فلسطینی ہر گاؤں کی حفاظت منتشر طور پر کر رہے تھے۔ کسی بستی میں دس لوگ پرانی بندوقوں سے مسلح ہو کر تحفظ کر رہے تھے، کسی میں پندرہ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب صہیونی فوج نے منظم حملے اور غارت گری شروع کی تو فلسطینی کوئی دفاع نہیں کر سکے اور ملینوں کی تعداد میں ان کو اپنے گاؤں، بستیاں اور آبادیاں چھوڑنی پڑیں۔ ان رفیوجیوں کی آج تیسری نسل ہے جو دنیا بھر میں، غزہ میں اور کچھ پاس پڑوس کے ملکوں میں پناہ گزیں ہے۔ اور افسوس یہ ہے کہ حماس اور الفتح یا فلسطینی مقتدرہ ابھی تک دونوں دھڑے اپنی الگ ہی چال چلنے پر مصر ہیں! اس کے علاوہ نتن یاہو کی پالتو یاسر ابوالشباب کی مسلح ملیشیا کہاں سے آئی ہے؟

عالم اسلام کی سیاسی تحریکیں

اب موجودہ صورت حال میں بظاہر ایسا لگ رہا ہے کہ دنیا میں سیاسی اسلام یا تحریکی اسلام پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہے، جس کی ابتدا مصر میں حافظ مرسی شہید کی حکومت کو خلیجی ممالک کی سازشوں کے ذریعہ گرا دینے سے ہو گئی تھی۔ اس کے وجود کو بچانا وقت کی ضرورت ہے کہ مغرب کے لیے اصل چیلنج اسلام کا یہی حرکی تصور ہے جس کو اب اپنے سروائیول (بقا) کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ البتہ بنگلادیش کے طلبائی انقلاب نے اس کو وہاں کچھ راحت ضرور دے دی ہے۔ صوفی اسلام استعمار پسند قوتوں کو سوٹ کرتا ہے اور اسی طرح سلفی اسلام ملوکیت کا خادم بنا ہوا ہے، ابن تیمیہؒ کی فکر کو اس نے عملاً چھوڑ دیا ہے۔ تو جو خلا مسلم معاشرہ میں پیدا ہو رہا ہے بظاہر اس کو پُر کرنے والی کوئی قوت سامنے نہیں ہے۔ روایتی علماء جن کا مسلم معاشرہ پر اب بھی بہت زیادہ ہولڈ ہے، ان میں جدید دنیا سے کو جاننے والے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ایسے میں نئے رجالِ کار درکار ہیں جو تیار، فعال اور متحرک ہوں اور معاشرہ میں قیادت کا رول ادا کرنے کی علمی و فکری اہلیت بھی رکھتے ہوں۔

آج سے چار دہائیوں قبل امریکی مفکر فوکویاما نے The End of History (تاریخ کا خاتمہ) لکھ کر گویا اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ اب دنیا میں امریکی مغربی لبرل تہذیب غالب ہو چکی ہے، اس کی بالادستی کو کوئی نظام چیلنج نہیں کر سکتا۔ اس کے بعض نتائج کو تاریخ نے غلط ثابت کر دیا ہے۔ لیکن اُس اعلان کی تہہ میں اسلامی تہذیب کی سیاسی سیادت کی موت کا جو اعلامیہ چھپا ہوا تھا اس کا سفر ابھی جاری ہے اور کوئی چیلنج اُس کو نہیں کیا جا رہا ہے۔ جو عالمِ اسلام کے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہونا چاہیے۔

(14 جولائی 2025ء بروز منگل، علی گڑھ)

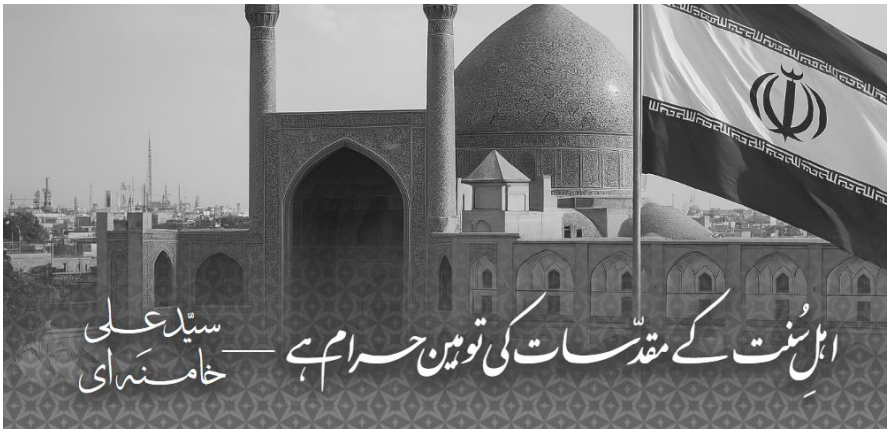

عالمِ شیعہ رہنما امام سید علی خامنہ ای نے ایک فتویٰ جاری کیا ہے جس میں پیغمبر اکرم ﷺ کی زوجہ حضرت عائشہؓ اور اہل سنت کی کسی بھی اسلامی علامت کی توہین کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس فتویٰ کا اسلامی دنیا میں وسیع پیمانے پر خیر مقدم کیا گیا ہے۔ امام خامنہ ای نے ایک سوال کے جواب میں اعلان کیا: ''سنی بھائیوں کی علامتوں کی توہین کرنا، جس میں پیغمبر اکرم ﷺ کی زوجہ [حضرت عائشہؓ] بھی شامل ہیں، حرام ہے۔ اس میں تمام انبیاء کی ازواج اور خاص طور پر حضرت محمد مصطفیٰ (ﷺ) کی مقدس ازواج بھی شامل ہیں۔''

امام خامنہ ای: ہمارے سنی بھائیوں کی علامتوں اور نبی کی ازواج (ﷺ) کو نشانہ بنانا حرام ہے

یہ فتویٰ الاحساء (سعودی عرب) کے علماء اور دانشوروں کے ایک گروہ کی طرف سے پوچھے گئے ایک استفتاء کے جواب میں جاری کیا گیا، یہ استفتاء لندن میں مقیم ایک نامعلوم شخص یاسر الحبیب کی جانب سے نبی کی زوجہ حضرت عائشہؓ کے خلاف حالیہ توہین آمیز بیانات کے بعد سامنے آیا تھا۔

استفتاء کرنے والوں نے سید خامنہ ای سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ ''نبی اکرم ﷺ کی زوجہ ام المؤمنین سیدہ عائشہؓ کی کھلے عام توہین اور انہیں نازیبا و توہین آمیز الفاظ سے ذلیل کرنے'' کے بارے میں اپنی رائے دیں۔

اس کے جواب میں خامنہ ای نے فرمایا:

> ''ہمارے سنی بھائیوں کی علامتوں کو نشانہ بنانا حرام ہے، چہ جائیکہ نبی اکرم ﷺ کی زوجہ پر ایسی باتوں کا الزام لگانا جو ان کی عزت و آبرو کو مجروح کرتی ہوں۔ بلکہ یہ امر تمام انبیاء کی ازواج کے لیے محال ہے، اور بالخصوص ہمارے سردار رسول اعظم ﷺ کی ازواج کے لیے۔''

خامنہ ای کا یہ فتویٰ حضرت سیدہ عائشہؓ کے خلاف حبیب کی توہین کی مذمت میں شیعہ ردعمل کے وسیع سلسلہ میں سب سے نیا اور اعلیٰ ترین سطح کا ردعمل سمجھا جاتا ہے۔

سعودی عرب، خلیجی ممالک اور ایران کے درجنوں ممتاز شیعہ مذہبی رہنماؤں نے اپنے بیانات اور اعلامیوں میں حضرت سیدہ عائشہؓ یا نبی اکرم ﷺ کی کسی بھی زوجہ کی توہین کی شدید مذمت کی ہے۔

استفتاء کا متن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سماحۃ آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای الحسینی دام ظلہ الوارف

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امتِ مسلمہ ایک ایسے فکری بحران سے گزر رہی ہے جو اسلامی مسالک کے پیروکاروں کے درمیان فتنہ وفساد پیدا کر رہا ہے، اور مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد کی ترجیحات کو نظر انداز کر رہا ہے، جس سے داخلی فتنے اور حساس و فیصلہ کن مسائل میں اسلامی کوششیں منتشر ہو رہی ہیں، اور فلسطین، لبنان، عراق، ترکی، ایران اور دیگر اسلامی ممالک میں امتِ مسلمہ کے فرزندوں کی حاصل کردہ کامیابیوں سے توجہ ہٹ رہی ہے۔ اس انتہا پسندانہ فکر کے نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ بار بار اور دانستہ طور پر اہلِ سنت کے محترم پیروکاروں کی علامتوں اور مقدسات کی توہین پر اکسایا جاتا ہے۔

فروغی سیٹلائٹ چینلز اور انٹرنیٹ پر بعض نام نہاد اہلِ علم کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ ام المؤمنین سیدہ عائشہ کی کھلی توہین، ان کی تذلیل اور ایسے فحش اور توہین آمیز الفاظ کا استعمال، اور ان پر ایسی باتوں کا الزام لگانا جو ازواجِ نبی، امہات المؤمنین رضوان اللہ تعالیٰ علیہن کی عزت وآبرو کو مجروح کرتی ہوں، اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

لہٰذا ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ شرعی موقف کو واضح طور پر بیان فرمائیں، کیونکہ ان توہین آمیز باتوں نے اسلامی معاشرے میں اضطراب پیدا کیا ہے اور اہلِ بیت علیہم السلام کے پیروکاروں اور دیگر اسلامی مسالک کے مسلمانوں کے درمیان نفسیاتی تناؤ کی کیفیت پیدا کر دی ہے، اور واضح رہے کہ ان توہین آمیز باتوں کو بعض بدنیتی پر مبنی افراد اور فتنہ پرور عناصر نے بعض سیٹلائٹ چینلز اور انٹرنیٹ پر منظم طریقے سے اسلامی ماحول کو خراب کرنے اور مسلمانوں کے درمیان فتنہ پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔

آخر میں، آپ اسلام اور مسلمانوں کے لیے عزت اور ذخیرہ بنے رہیں۔

دستخط

علماء اور دانشور الاحساء کا ایک گروہ

4 شوال 1431 ہجری

https://en.abna24.com

سارا فساد شریعت کی تعلیمات پر عمل نہ ہونے کی وجہ سے ہے

مولانا مفتی محمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ نحمدہ و نصلی و نسلم علیٰ رسولہ الکریم اما بعد۔

ایک دلخراش واقعہ پیش آیا ہے بلوچستان میں، اور اس طرح کے واقعات صرف بلوچستان میں نہیں، خیبر پختونخوا میں، پنجاب میں، سندھ میں ہر جگہ پیش آتے رہتے ہیں، وقتاً فوقتاً پیش آتے ہیں کہ کوئی جوڑا اگر پسند کی شادی کر لیتا ہے تو دونوں کو یا کم از کم لڑکی والے اپنی لڑکی کو قتل کر دیتے ہیں۔ تو اسی طرح کا یہ واقعہ پیش آیا کہ لڑکی کے ہاتھ میں پہلے قرآن ہے، وہ قرآن اس سے چھینا گیا، اور اسے دیوار کی طرف چلایا گیا، ایک خاص جگہ کھڑا کیا گیا، آس پاس چند گاڑیاں ہیں، کچھ لوگ اسلحہ بردار موجود ہیں، اور اسے گولیوں سے بھون دیا گیا۔

تو یہ دلخراش واقعہ ہمارے معاشرے کا وہ ایک المناک رخ ہے کہ جس پر آدمی کو شرم آتی ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارے دین کی تعلیمات بڑی پاکیزہ، بڑی عمدہ، بڑی پیاری تعلیمات ہیں۔ اگر والدین اور اولاد دونوں ان تعلیمات کو پیش نظر رکھ کر اس طرح کے معاملات نمٹائیں شادی بیاہ کے، نکاح کے، تو کسی قسم کی الجھن پیدا نہ ہو۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس سلسلہ میں فریقین افراط و تفریط کا شکار ہیں۔

اولاد بعض اوقات سکول کالج کے ماحول میں، یا ویسے بے پردگی اور عریانی کے ماحول میں وہ ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوتے ہیں، جو چند روزہ ہوتی ہے اور اس کے بعد پھر ختم ہو جاتی ہے، اور وہ لڑکی کسی غلط جگہ پھنس جاتی ہے اور اس کے بعد اس کے لیے نہ واپسی کا راستہ ہوتا ہے، نہ شوہر اس کو صحیح طریقے سے رکھ رہا ہوتا ہے، وہ اس پر ظلم کے پہاڑ توڑتا ہے، لیکن لڑکی مجبور ہوتی ہے، کئی دفعہ خودکشی تک کے واقعات پیش آتے ہیں۔ تو اولاد کو اپنے والدین پر اعتماد کرنا

چاہیے نکاح اور رشتہ کے سلسلہ میں۔ والدین کا تجربہ ہوتا ہے، والدین اپنی اولاد کے لیے خیر خواہ ہوتے ہیں، اور ان کے مشورے سے ہی اس طرح کے امور طے ہونے چاہئیں، اسی میں اولاد کا فائدہ ہے۔

البتہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ لڑکی یا لڑکے کی عمر زیادہ ہو رہی ہوتی ہے اور والدین اپنی خود ساختہ شرطوں میں الجھے ہوئے ہوتے ہیں، یا برادری ازم میں الجھے ہوئے ہوتے ہیں، اور کتنا معقول رشتہ لڑکا یا لڑکی بتا رہی ہو کہ فلاں جگہ مجھے شادی کرنی ہے، لڑکا پڑھا لکھا ہے، لڑکا دیندار ہے، سیرت اور کردار والا ہے، خوش اخلاق ہے، اچھی کمائی کرتا ہے، لیکن چونکہ ہماری برادری کا نہیں ہے اس لیے ہم نہیں کریں گے۔ اور لڑکیاں بعض اوقات چالیس چالیس سال کی عمر تک پہنچ جاتی ہیں۔ اور اسی طرح یا جہیز اتنا نہیں دے سکتا، یا اس کے پاس ذاتی مکان نہیں ہے، یا فلاں فلاں چیزیں نہیں ہیں، تو اس لیے ہم رشتہ نہیں کر سکتے اور چالیس چالیس سال تک اپنی بیٹیوں کو بٹھائے رکھتے ہیں۔ وہ نفسیاتی مریضہ ہو جاتی ہیں، وہ بڑھاپے میں داخل ہو جاتی ہیں، اور وہ گھٹ گھٹ کر زندگی گزار رہی ہوتی ہیں۔ تو یہ والدین کی طرف سے بھی بہت ہی زیادتی کا معاملہ ہوتا ہے۔

اگر لڑکی نے کوئی معقول رشتہ آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ اگرچہ لڑکے اور لڑکی کا خلوت میں بیٹھنا اور اس طرح نکاح کے بغیر دوستیاں لگانا، یہ ناجائز اور حرام ہے، حدیث میں آتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ خلوت میں نہیں بیٹھتا مگر تیسرا شیطان ہوتا ہے۔ اور جب عورت بے پردہ باہر نکلتی ہے تو ''استشرفها الشيطان'' شیطان اس کی تاک میں رہتا ہے، لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ تو یہ جو پردہ ہے، حیا ہے، یہ عورت کی حفاظت کے لیے ہے، عورت کی عزت کی حفاظت کے لیے ہے، اس پر اولاد کو عمل کرنا چاہیے، وہ اگر اس میں کوتاہی کریں گے تو گناہگار ہوں گے، اور اس طرح کے غلط رویوں کا نتیجہ بھی پھر غلط نکلتا ہے۔

لیکن اس سب کے باوجود فقہ حنفی میں اگر بالغ لڑکا اور لڑکی آپس میں رضامندی سے نکاح کریں، اور نکاح کی شرائط موجود ہوں، دو گواہوں کی موجودگی میں نکاح ہو، تو ایسی صورت میں وہ نکاح باطل نہیں ہوتا۔ وہ نکاح، نکاح ہوتا ہے۔ اور ایسی صورت میں اس طرح کے کسی جوڑے کو قتل کرنے کا شریعت کا کوئی حکم نہیں ہے، یہ ظلم اور زیادتی ہے، یہ قتلِ عمد ہے۔ اس میں لوگوں کو اور دونوں فریقوں کو شریعت کی تعلیمات پر عمل کرنا چاہیے اور اس طرح کا ظلم وستم اب بند ہو جانا چاہیے۔

ریاست کہاں کھڑی ہے، جہاں اس طریقے سے لوگوں کو بے دردی سے سرِعام ایک میدان میں ایک صحرا میں قتل کیا جا رہا ہے، یا کسی آبادی میں قتل کیا جا رہا ہے، بعض اوقات لوگ گھروں میں گھس کر ایسے جوڑے کو قتل کر دیتے ہیں، تو ریاست کو بھی اس سلسلہ میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے، وہ ایسے مجرموں کو پکڑیں اور قتلِ عمد کی سزا میں ان کو قتل کی سزا جاری کرے، تاکہ ہمارے ملک سے اس طرح کے جرائم کا خاتمہ ہو اور اس طرح کے ظلم وستم کا خاتمہ ہو۔

ہم سب کو اس طرف متوجہ کر رہے ہیں کہ سب اپنی اپنی ذمہ داریاں ادا کریں اور شریعت کی تعلیمات پر عمل کریں، یہ سارا فساد شریعت کی تعلیمات پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ سب اگر شریعت کی تعلیمات پر عمل کریں گے تو سب کا اس میں فائدہ ہے، دنیا میں بھی سکون ہے، آخرت کی زندگی بھی کامیابی والی زندگی ہوگی۔ اور اس کے بغیر ہمارے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے، آخرت میں بھی رسوائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے معاشرے پر رحم فرمائے، اور سب کو دین کی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)۔

https://youtu.be/eUtfYg4ydh4

فساد کے اِس دور میں بچوں کو ہاتھ لگانے کی بھی اجازت نہیں

مولانا مفتی طارق مسعود

سوال: ہمارے قاری صاحب ہمیں آنکھوں پہ پٹی باندھ کر قمیص اتار کر گیس کے پائپ سے مارتے تھے (اللہ ہدایت دے یار۔ مفتی صاحب) اب میں سوچتا ہوں تو غصہ بہت آتا ہے، کیا ان کے خلاف ذاتی کاروائی کر سکتا ہوں؟

جواب: اپنے قاری صاحب کے خلاف فی الحال تو کاروائی نہ کریں لیکن یہ تحقیق کریں کہ ابھی بھی اگر وہ یہ کام کر رہے ہیں دوسرے بچوں کے ساتھ تو پھر ان بچوں کے ماں باپ کو بتائیں کہ اِن کو سمجھائیں، نہیں سمجھاتے، ایف آئی آر کٹائیں، ویڈیو بنا کر تھانے میں جا کر ایف آئی آر کٹائیں۔

اسلام میں بڑوں سے زیادہ حقوق کس کے ہیں؟ بچوں کے۔ بچے کو صدقہ کرنے کی اجازت نہیں ہے، آپ اندازہ لگا لو، کیونکہ اس کا مال ذاتی مال ہے، آپ اس سے صدقہ نہیں کروا سکتے، کیونکہ اس کا پیسہ ضائع ہو رہا ہے، شریعت کہتی ہے بالغ ہو گا عقل ہو گی پھر مانیں گے، ابھی اسی کے لیے رکھے جائیں یہ پیسے۔ تو مارنے کی کہاں سے اجازت ہو گئی میرے بھائی؟ اور درندوں کی طرح بعض قاری لوگ کوٹتے ہیں۔

تو اس لیے مجھ سے لوگ پوچھتے ہیں کہ قاری بچوں کو مار سکتا ہے؟ میں جواب میں کہتا ہوں اس زمانے میں مارنا تو دور کی بات، کسی قاری کو استاذ کو، چھوٹے بچے کی بات کر رہا ہوں، مارنا دور کی بات، ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہے۔ صرف سر پہ پیار کرے، بس۔ سر پہ ہاتھ رکھے، بس۔ باڈی کو بھی ٹچ کرنے کی اجازت نہیں ہے، یہ فساد کا دور ہے۔ تو کسی بھی مسجد میں مدرسے میں سکول میں کہیں بھی ایسا ہو رہا ہے کہ قاری صاحب بچے کو تھپڑ مار رہا ہے، ماں باپ بولیں بھئی آپ کو پرمیشن نہیں دی ہاتھ لگانے کی۔ ٹھیک ہے وہ اب فتویٰ لائیں گے جائز ہے، میں ان فتووں میں نہیں پڑ رہا، میں بات کر رہا ہوں کس کی؟ اس زمانے کی۔ قطعًا اجازت نہیں ہے، کیونکہ اس کی کوئی لمٹ نہیں ہے، آپ نے ایک تھپڑ کی اجازت دے دی، وہ دو چار دس، کوٹتا ہے، وہ اپنی ٹھرک نکالتا (ہے)، ہاتھ پاؤں ٹوٹتے ہوئے دیکھے ہیں میں نے قاریوں کے ہاتھوں

بچوں کے۔

ایک بچے سے میں ملا، سنتا ہی نہیں ہے، بڑا ہو گیا ہے اب تو، شادی ہو گئی، اس کے بچے ہو گئے، سنتا ہی نہیں ہے۔ میں نے کہا، کیا ہوا، سماعت کیوں کمزور ہے؟ کہہ رہے ہیں، قاری نے ایک تھپڑ مارا تھا اتنی زور سے، کانوں کی سماعت چلی گئی۔ تو اس لیے۔

سارے قاری ایسے نہیں ہوتے، ہم نے بھی قاریوں سے پڑھا ہے، اللہ کا شکر ہے کبھی نہیں تھپڑ مارا۔ میں نے جس مدرسے میں پڑھا ہے، کبھی نہیں مار پڑی۔ صرف ایک دفعہ پڑی تھی، مجھے آٹھ سال میں ایک تھپڑ پڑا تھا، اتنا تو حق بنتا ہے، وہ تو دو چار پڑتے، ہم تو اور۔ ہمیں تو خوشی ہوتی تھی ہمارے استاذ ماریں، کیوں؟ ہمارے استاذ ہی اتنے نرم دل ہمیں ملے، اتنے پیارے پیارے سویٹ سویٹ سے استاذ تھے کہ وہ تو ہمیں مارتے تو ہمیں خوشی ہوتی یار اس سے فائدہ بھی تو ہوتا ہے نا۔ لیکن ایسے استاذ مارکیٹ میں بھی تو شارٹ چل رہے ہیں۔ تو مجھے ایک تھپڑ پڑا ہے، طالب علمی، مدرسے کی بات کر رہا ہوں۔ استاذ بھی پٹھان، پٹھان ٹیچر تھے، بڑے سخت تھے، پورے دورہ حدیث تک انہوں نے ایک تھپڑ مارا، وہ بھی گردن پہ۔ وہ بھی کیسے مارا؟ دورہ حدیث کا پرچہ، دورہ حدیث نہیں، اس سے پہلے جو موقوف علیہ ہوتا ہے، میں ایسے تیاری کر رہا ہوں رات کو حاشیے دیکھ رہا ہوں، صبح پیپر ہے، ایک دم ایک غیبی آواز آئی نا، تو مجھے لگا، پہلے میں سمجھا کوئی فرشتوں کی آواز ہے کہیں سے، پھر مجھے لگا کہ کچھ محسوس سا ہوا یہاں (گردن) پر۔ لیکن تکلیف بعد میں ہوتی ہے، سنتا پہلے ہے۔ تکلیف کی سپیڈ سے آواز کی سپیڈ تیز ہے۔ تو مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا اس دن کہ تکلیف محسوس کرنے کی سپیڈ سے جو آواز کی سپیڈ ہے، دیکھو سائنسدان اسی طرح تو فارمولے نکالتے ہیں۔ تو میں نے دیکھا یہ ہوا کیا ہے؟ تو میرے استاذ کھڑے ہوئے تھے، انہوں نے گردن پہ ایک رکھ کے لگایا۔ انہوں نے کہا پورے سال تمیز سے محنت کرتے نا تو اس وقت ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے نہیں (ہوتے)۔ انہوں نے دیکھا نا کہ۔ ہمیں ذرا بھی نہیں دل میں، ہمیں تو خوشی ہوتی تھی یار ہم ویسے کہاں سے بخشے جائیں گے بھئی۔ تھوڑا سا استاذوں سے پٹ جائیں تو شاید اللہ بخشش کر دے۔ تو ہمیں تو خوشی ہوئی، بس وہ ایک لگا تھا۔

اور ایک سزا ملی ہے مجھے دورہ حدیث میں۔ دورہ حدیث میں آدمی پورا مولانا بن چکا ہوتا ہے۔ ہو یہ رہا تھا کہ ہم رات کو مطالعہ کرتے تھے، صبح کوئی طالب علم کتاب اٹھا کر کہیں اور رکھ دیتا تھا، وہ صفائی والا۔ کتاب ہی نہیں ملتی تھی، دو چار دفعہ ایسا ہوا، سبق میں بیٹھے ہوئے ہیں، کتاب ہی نہیں ہے۔ وہ کتاب صفائی والا پتہ نہیں کہاں رکھ دیتا تھا۔ تو ہم چار طالب علم تھے دورہ حدیث میں، چاروں کے پاس کتاب نہیں ہے۔ تو ہمارے استاذ نے دو دن تین دن تنبیہ کی، اس کے بعد ہم چاروں کو مرغا بنا دیا۔ اب اچھے بھلے بڑے مرغے تھے۔ ہم چاروں بنے ہوئے ہیں مرغا۔ بس، تھوڑی دیر بنائے رکھا، پھر ڈانٹا، بولے انسان کے بچے بنو، کتاب، تو پھر ہم کتاب لا کر بیٹھتے تھے، بس۔

اور ایک اور یاد آ گئی مجھے ایک سزا۔ وہ سزا یہ تھی کہ، روزانہ میرا واش روم کا ٹائم اس وقت تھا جب کلاس شروع ہوتی تھی۔ ایک دن دو دن ہو گئے استاذ نے دیکھا روز لیٹ آ رہا ہے، میرا ٹائم، سیٹنگ ہی ایسی ہو گئی تھی۔ تو مجھے استاذ نے تھوڑی

دیر کھڑا رکھا کہ آپ کو اب آنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ وہ بھی پٹھان استاذ تھے۔ بس اتنا۔ پھر بھی ہم ٹوٹا پھوٹا پڑھ ہی لیے نا یار۔ خواخواہ میں جنگلیوں کی طرح کوٹنا پیٹنا مارنا، اس سے بچے کے اخلاق خراب ہوتے ہیں۔

اور ایک اور واقعہ میں بار بار سناتا ہوں، یہ بعض ٹیچر اور استاذ کہتے ہیں کہ بچے مار کے بغیر پڑھتے نہیں ہیں۔ یہ بھی ہنڈرڈ پرسنٹ غلط ہے۔ ایک مدرسے میں، میں نے چند دنوں کے لیے پڑھایا، بلکہ چند دن نہیں چھ سات مہینے کے لیے پڑھایا۔ میرے پاس پچاس بچے تھے چھوٹے چھوٹے پدے پدے، اتنے اتنے سے۔ یعنی ایک کلاس کے دو حصے تھے، سیکشن اے سیکشن بی ہوتا ہے نا، تو پچاس بچے میرے پاس، پچاس بچے اسی کلاس کے سامنے ٹیچر کے پاس۔ اور کتابیں دونوں کی سیم (same)۔ میں نے چھ سات مہینے میں نہ کسی کو تھپڑ مارا ہوگا، نہ کسی کو ڈانٹا ہوگا، مزے سے گپ شپ لگا کے لطیفے سنا سنا کے ان کو میں نے پڑھا دیا۔ سامنے ٹیچر، روزانہ بچے پٹ بھی رہے ہیں، کوئی مرغا بنا ہوا ہے، کوئی ایک ٹانگ پہ، کوئی ہیلی کاپٹر، کوئی بغیر کرسی کے بیٹھا ہوا ہے، سمجھ رہے ہیں؟ اور میرے بچوں کا رزلٹ بھی وہی جو ان کے بچوں کا رزلٹ۔

میں نے کہا، الگ الگ بھی مدرسہ بھی ہوتا نا، میں کہتا اس مدرسے کے بچے نالائق ہیں۔ یا الگ الگ کلاسیں ہوتیں، یا الگ الگ کتابیں ہوتیں تو کوئی کہہ سکتا تھا بھئی وہ کتاب ایسی ہے جو مار کے بغیر نہیں پڑھائی جا سکتی، اور یہ کتاب ایسی ہے جو مار کے بغیر پڑھائی جا سکتی ہے۔ میں نے کہا، میرا ایمان اور مضبوط ہو گیا، یہ جو کہتے ہیں نا مار کے بغیر بچے پڑھتے نہیں ہیں، یہ ان کی اپنی ٹھرک ہوتی ہے، گھر میں بیوی کے ساتھ ان کا جھگڑا ہوتا ہے، مسائل ہوتے ہیں، یا یہ خود اتنے پٹے ہوتے ہیں بچپن میں، کہ وہ پٹائی آگے پارسل کر رہے ہوتے ہیں۔

تو ہم نے تو پڑھایا ہے بھئی، ایسے بچے، چٹکلے سناتا تھا، ہنستے تھے، پھر پڑھنا شروع کر دیتے تھے۔ بچوں کو بچوں کے سٹائل میں پڑھانا پڑتا ہے۔ میں ترنم سے پڑھاتا تھا بچوں کو۔ ترنم سے، ایسی سر لگا کر، لے لگا کر، بچے بھی وہی لے میں یاد کرتے تھے۔ تو آپ کی اپنی بداخلاقی ہوتی ہے، آپ کی اپنی ٹھرک ہوتی ہے، آپ سمجھتے ہو کہ بچے مار کے بغیر پڑھیں گے نہیں۔ بچے پہ ہاتھ اٹھایا اگر آپ نے، بچہ معاف بھی کرے گا تو وہ معاف۔ دیکھو بڑے کو آپ نے تھپڑ مار دیا نا، آپ نے سوری کی، اس نے کہا میں نے معاف کیا، اللہ کیا کر دے گا؟ معاف۔ لیکن آپ نے بچے کو مارا نا، بچہ سو دفعہ کہے میں نے معاف کیا، اللہ کہتا ہے بچے کی معافی کا شریعت میں اعتبار نہیں ہے۔ ہے ہی نہیں اعتبار۔

اس لیے بچے کے حقوق بہت زیادہ ہیں بھئی! بچے پہ صرف ماں باپ ہاتھ اٹھا سکتے ہیں، اور ماں باپ کی پرمیشن سے جو ان کے قریبی رشتہ دار ہیں، جو خاندان کے بڑے ہوتے ہیں، باقی کوئی بھی بچے پہ ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔

https://youtu.be/Lnd5JDH5y_o

مولانا قاری محمد ابوبکر صدیق ☆ مولانا حافظ عزیز احمد

تقریظ ہمدم عمرؓ

مولانا قاری محمد ابوبکر صدیق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، نحمدہ ونصلی ونسلم علیٰ رسولہ الکریم اما بعد۔

زیر نظر کتاب ''ہمدم عمرؓ'' مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ راشد امیر المؤمنین سیدنا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سیرتِ مبارکہ پر لکھی جانے والی پہلی غیر منقوط کتاب ہے جو کہ جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام مدنی محلہ جہلم کے استاذ الحدیث برادرم حضرت مولانا محمد فاروق شاہین صاحب مدظلہ کے منفرد علمی ذوق کا مظہر اور حضرات خلفائے راشدینؓ سے والہانہ عقیدت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ قبل ازیں وہ خلیفہ اول بلافصل سیدنا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سیرتِ مبارکہ پر ''ہمدم مکرمؓ'' کے نام سے پہلی غیر منقوط کتاب تحریر کرنے کی سعادت بھی حاصل کر چکے ہیں۔

مولانا موصوف کا شمار جامعہ کے ان قابلِ فخر فضلاء میں ہوتا ہے جن میں اپنے اکابرین بالخصوص قائد اہلِ سنت وکیلِ صحابہؓ حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحبؒ اور فخرِ اہلِ سنت حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب جہلمیؒ کی تعلیمات اور تربیت کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اور ان اکابرین کے فیض یافتگان میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ یہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہؓ اور اہلِ بیت بالخصوص حضرات خلفائے راشدینؓ کی سچی محبت و عقیدت سے سرشار ہوتے ہیں، ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ رب تعالیٰ مولانا موصوف کی اس عظیم علمی کاوش کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطاء فرمائیں اور ان کی زندگی و صحت میں، علم و عمل میں، تقویٰ اور اخلاص میں مزید برکت عطاء فرمائیں۔ آمین بجاہ النبی الکریمؐ۔

خادم اہلسنت والجماعت، قاری محمد ابوبکر صدیق غفرلہ

۱۵ ذی الحجہ ۱۴۴۶ھ بروز جمعرات بمطابق ۱۲ جون ۲۰۲۵ء

مولانا محمد فاروق شاہین: ایک ہمہ جہت شخصیت

مولانا حافظ عزیز احمد

دینی وعلمی شخصیات کا تذکرہ محض سوانحی بیان نہیں، بلکہ اہلِ علم کے لیے رہنمائی، جذب و شوق کی بیداری اور اخلاصِ عمل کا آئینہ ہوتا ہے۔ ان نفوسِ قدسیہ کی حیات میں علم کی جستجو، عمل کی استقامت، اور خدمتِ دین کی وہ بے لوث روح پوشیدہ ہوتی ہے جسے دیکھ کر دلوں میں خیر کے چراغ روشن ہوتے ہیں۔ مولانا محمد فاروق شاہین صاحب بھی ان ہی باکمال شخصیات میں سے ایک ہیں، جنہوں نے درس و تدریس، علم و ادب اور تصنیف و تالیف کے میدان میں ایک خاص مقام پیدا کیا۔ ان کا سفرِ حیات نہ صرف مدارس کے طلبہ اور اساتذہ کے لیے مشعلِ راہ ہے بلکہ اردو ادب کے سنجیدہ قاری کے لیے بھی بصیرت کا سرمایہ ہے۔

نسب و مقامِ ولادت

ہزارہ کے سرسبز و شاداب پہاڑی علاقوں سے تعلق رکھنے والے مولانا محمد فاروق شاہین صاحب پنجاب کے تاریخی شہر جہلم کی قدیم و معروف دینی درسگاہ جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام میں استاذ الحدیث ہیں۔ آپ 11 دسمبر 1977ء کو اندر کوٹ دروازہ، ایبٹ آباد ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ محترم کا نام "محمد اذان عباسی" ہے جو ایک عرصہ تک چیئر لفٹ ایوبیہ میں سپروائزر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔

ابتدائی عصری تعلیم

آپ نے عصری تعلیم کا آغاز گورنمنٹ پرائمری سکول خانس پور ایوبیہ سے کیا۔ مڈل گورنمنٹ مسلم ہائی سکول بنی چوک راولپنڈی سے پاس کی، جبکہ میٹرک تک کی تعلیم گورنمنٹ ہائی سکول خانس پور ایوبیہ سے مکمل فرمائی۔

ناظرہ و حفظ قرآن مجید

1989ء میں آپ کا تعلق دارالعلوم فیض القرآن عیدگاہ روڈ راولپنڈی سے قائم ہو گیا۔ یہاں رہ کر آپ نے صرف ایک سال کی قلیل مدت میں قاری غلام یاسین رحمۃ اللہ علیہ (آف کوٹ گلہ تلہ گنگ) سے ناظرہ قرآن مجید پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔ اس کے بعد قرآن حکیم کو اپنے سینے میں محفوظ کرنے کی آرزو لیے، قاری عابدالرشید صاحب کھوکھر کی نگرانی میں تقریباً ڈھائی سال کی پیہم ریاضت کے بعد حفظ قرآن مجید کا اعزاز پایا، جبکہ تجوید و قرأت کے فن میں کمال حاصل کرنے کے لیے قاری سلیم صاحب سے فیض حاصل کیا۔

دینی تعلیم کے حصول کے سلسلے میں جامعہ حنفیہ جہلم آمد

سن 1993ء میں دینی تعلیم کے حصول کی غرض سے آپ نے جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام جہلم میں داخلہ لیا۔ ابتدائی درجات سے لے کر دورہ حدیث شریف تک کی تعلیم اسی مدرسے میں رہ کر مکمل ہوئی۔ آپ کے مشہور اساتذہ میں مولانا نور اشرف صاحب ہزاروی، شیخ الحدیث مدرسہ ہذا مولانا قاری ظفر اقبال صاحب مدظلہ، مناظر اعظم علامہ عبدالستار تونسوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا منیر احمد منور مدظلہ اور مولانا منظور احمد نعمانی رحمۃ اللہ علیہ (ظاہر پیر) کے نام نمایاں ہیں۔

دورانِ تعلیم اساتذہ و علوم کی تفصیل

دورانِ تعلیم درسِ نظامی کے نصاب میں، آپ نے مولانا نور اشرف ہزاروی سے صرف، تفسیر اور ابوداؤد شریف کا درس لیا۔ مولانا سعید احمد صاحب انگی سے نحو، معانی و بیان اور مشکوٰۃ شریف پڑھی۔ مولانا قاری ظفر اقبال صاحب میانوالوی سے منطق، اصولِ فقہ اور بخاری شریف، مولانا عبدالودود صاحب سے ترمذی، اور مولانا سلطان صاحب کوہستانی سے مسلم شریف کی تعلیم حاصل کی۔ فقہ کے دقیق علوم کی تحصیل کے لیے آپ نے مولانا رانا احمد خان صاحب سرگودھوی اور مولانا عبدالودود صاحب ہزاروی کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہہ کیا۔

درس و تدریس کا آغاز

2002ء میں درسِ نظامی کی رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد اگلے سال 2003ء میں اپنے مادرِ علمی جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام جہلم ہی سے تدریس کا آغاز کیا۔ گزشتہ دو دہائیوں سے زائد عرصے میں درسِ نظامی کی متعدد چھوٹی بڑی کتب آپ کے زیرِ تدریس رہیں، جس سے سیکڑوں طلبہ مستفید ہوئے۔ اس سال بھی نحو میر، شرح تہذیب، توضیح تلویح، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ اور شمائل ترمذی کے اسباق آپ سے متعلق ہیں۔

تحصیل علم کا تسلسل

راقم الحروف کو سن 2011ء میں مولانا محمد فاروق شاہین صاحب سے "شرح تہذیب" پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ اس وقت ان کا ایک جملہ، جو انہوں نے ہمیں بطور نصیحت فرمایا تھا، مجھے اب بھی یاد ہے: "علماء کی حصولِ علم سے فراغت دراصل تکمیلِ علومِ دین نہیں بلکہ آغازِ علومِ دین ہے"۔ آپ مزید فرماتے تھے کہ "درسِ نظامی کا یہ کورس تو محض ایک چابی ہے جس سے

علوم کے دروازے کھلتے ہیں، یہ تکمیل ہرگز نہیں"۔ یہ نصیحت صرف علماء کے لیے ہی نہیں تھی بلکہ آپ نے خود اس پر عمل کر کے بھی دکھایا۔ چنانچہ، اگرچہ مولانا موصوف نے 2002ء میں سندِ فراغت حاصل کر کے تدریس کے شعبے سے وابستگی اختیار کر لی تھی، تاہم آپ نے حصولِ علمِ دین کو کبھی ترک نہیں کیا۔ آپ نے اس سلسلے میں در در کی خاک چھانی اور تاحال آپ کی جہد و جہد جاری ہے۔ آپ کچھ عرصہ دارالمبلغین، نواں شہر ملتان میں بھی مقیم رہے، جہاں آپ نے علامہ عبدالستار تونسوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبدالغفار تونسوی مدظلہ العالی، مولانا منیر احمد منور اور مولانا بشیر احمد الحسینی (شور کوٹ والے) سے علمِ جدل و مناظرہ کے مختلف اسباق پڑھے۔ اسی تسلسل میں، آپ نے محترم مولانا مفتی انور غازی صاحب مدظلہ سے صحافت اور مضمون نگاری کا علم بھی حاصل کیا۔

تخصصات کی تفصیل

2004ء کی سالانہ تعطیلات میں آپ نے جامعہ حقانیہ ساہیوال سے ممتاز اساتذہ مفتی سید عبدالقدوس صاحب ترمذی اور مفتی محمد اعظم صاحب ہاشمی (فیصل آبادی) کی نگرانی میں تخصص فی الفقہ کیا۔ تخصص فی علم المیراث کی تعلیم اپنے استاذ مولانا محمد سعید صاحب اٹکی سے حاصل کی۔

تصوف و سلوک

تصوف و سلوک میں آپ نے پہلی بیعت قائد اہل سنت وکیل صحابہ حضرت مولانا قاضی مظہر حسین رحمۃ اللہ علیہ تلمیذ و خلیفہ مجاز حضرت مدنی قدس سرہ سے کی۔ 2004ء میں جب آپ کا وصال ہو گیا تو اس کے بعد آپ نے خلیفہ مجاز حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب سومرو سے اپنا روحانی تعلق قائم کیا۔

اخلاق و مزاج

آپ نہایت خوش مزاج، کریمانہ اخلاق اور صاف ستھرے کردار کے پیکر ہیں، طبیعت میں بے حد تواضع و انکساری پائی جاتی ہے۔ ان کی صحبت میں بیٹھنے والا شخص، خواہ کتنا ہی وقت گزار لے، ان کے اندر تکبر یا بڑائی کا ذرہ برابر بھی شائبہ محسوس نہیں کرتا۔

نام کی تبدیلی

آپ کا پیدائشی نام محمد شاہین تھا، مگر بانی تحریک خدامِ اہل سنت مولانا قاضی مظہر حسین نے اس نام میں تبدیلی کا حکم دے کر دو نام تجویز فرمائے: محمد فاروق اور فاروق احمد۔ بانیِ مدرسہ ہذا مولانا قاضی عبد اللطیف جہلمی (خلیفۂ مجاز حضرت لاہوری) نے پہلے نام کو منتخب فرما کر آپ کا نام "محمد فاروق" رکھ دیا۔ بعد ازاں، حضرت جہلمی کے جانشین صاحبزادہ مولانا قاری خبیب احمد عمر نے اس میں مزید تبدیلی کے ساتھ آپ کا نام "محمد فاروق شاہین" کر دیا، اور اب یہی نام آپ کی پہچان بن چکا ہے۔

درس قرآن و حدیث اور فتویٰ نویسی

جہلم شہر کی مرکزی جامع مسجد گنبد والی میں آپ عرصہ دراز سے روزانہ فجر کی نماز کے بعد درس حدیث جبکہ عشاء کی نماز کے بعد درسِ قرآن دیتے چلے آ رہے ہیں۔ اب مفتی محمد شریف صاحب مدظلہ، جو پہلے اس مرکزی جامع مسجد سے ملحقہ دارالافتا میں لوگوں کو مسائل کا حل بتاتے اور فتویٰ دیتے تھے اور جو مجاہدِ اہلِ سنت مولانا قاضی عبداللطیف جہلمی کے پرانے رفیق ہیں، کی ضعیف العمری کے باعث دارالافتا کی تمام ذمہ داریاں بھی حضرت مفتی صاحب ہی کی نگرانی میں مولانا محمد فاروق شاہین صاحب کو سونپ دی گئی ہیں۔

خطابت کی خدمات

2004ء میں آپ جامع مسجد عمر (مشین محلہ نمبر 3) میں خطیب مقرر ہوئے، جسے آپ نے کم و بیش پندرہ برس بحسن خوبی انجام دیا۔ 2021ء میں آپ جہلم شہر سے کچھ فاصلے پر راولپنڈی جی ٹی روڈ پر واقع علی جامع مسجد سٹی ہاؤسنگ راٹھیاں جہلم میں منصبِ خطابت پر فائز ہوئے اور تاحال یہ خدمت وہیں انجام دے رہے ہیں۔

تصنیفی خدمات

آپ تدریسی ذوق کے ساتھ ساتھ خارجی کتب کے وسیع اور گہرے مطالعے کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ اسی وُسعتِ نظر اور غور و خوض کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسے منفرد کام کی توفیق بخشی جو اردو ادب میں یکتائے زمانہ کہلانے کا مستحق ہے۔ اِس وقت آپ کی دو ایسی تالیفات منظرِ عام پر آ چکی ہیں جو صرف عنوان ہی کے اعتبار سے نہیں، بلکہ اپنے اسلوبِ تحریر اور فنی ترتیب کی بنا پر بھی اہلِ علم کے لیے باعثِ حیرت و تحسین ہیں۔ ان میں پہلی کتاب "ہمدم مکرم" ہے، جو یارِ غار و مزار، خلیفۂ بلافصل، سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شانِ اقدس میں بے نقط زبان میں تحریر کی گئی ہے۔ اس نادر اسلوب کی جھلک دیکھنے کے لیے یہ اقتباس پڑھیں:

ہمدم مکرم اور علمائے اسلام کا کلام

"علمائے اسلام سے مروی ہے کہ ہمدم مکرم، دور موسوی کے مرد مسلم سے اس لئے اولیٰ ہے کہ وہ موسی رسول اللہ صلی اللہ علی روحہ وسلم کا کلامی حامی رہا؛ مگر ہمدم مکرم کا حوصلہ ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علی رسولہ وسلم کا روح و دل سے مددگار رہا اور دامی درمی، کلامی، عملی ہر طرح سے مددگار اور حامئ رسول رہا۔ سرّہ اللہ۔" (ہمدم مکرم، صفحہ 42)

ہمدم عمر سرّہ اور مکے والوں کا سردار

دوسری کتاب "ہمدم عمر" ہے، جو خلیفۂ دوم، فاروقِ اعظم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حیاتِ مبارکہ اور سیرت پر اسی فنی اسلوب میں مرتب کی گئی ہے۔ لیجیے اس کتاب سے بھی ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"سرکار دوعالم صلی اللہ علی رسولہ وسلم کو اطلاع ہوئی کہ اہل مکہ معاہدہ صلح کے مکسّر اور اس سے روگرداں ہو گئے ادھر اس معاہدہ صلح کو ٹکڑے کر کے اہل مکہ سرگرداں اور ڈرے سہمے رہے کہ اہل اسلام کسی لمحے مکہ مکرمہ دھاوا آور ہوں گے اس لئے رائے دی گئی کہ اس حال کے سدھار کے لئے کہ مکّہ والوں کا سردار معمورہ رسول راہی ہو اور معاہدہ کو سرے سے کر کے لوٹے مگر اہوں کا سردار اس ارادے سے مکہ مکرمہ سے راہی ہوا معمورہ رسول آکر اولاً رسول اللہ صلی اللہ علی رسولہ وسلم سے ملا اور صلح کے واسطے سے کلام کی مگر رسول اکرم صلی اللہ علی رسولہ وسلم کے کلام وعمل سے اسے معلوم ہوا کہ صلح کا معاملہ اعسر و محال ہے وہاں سے اٹھ کر ہمدم مکرم سرّہ اللہ سے آکر ملا مگر وہ اس کی مدد سے دور رہے ہمدم عمر اور ہمدم علی کرّمہ اللہ کے ہاں وارد ہوا اور دوڑ، سعی کی ہر دو کے واسطے سے معاہدہ صلح سرے سے طے ہو مگر وہ ہر دو اس کی امداد سے الگ رہے مروی ہے کہ ہمدم عمر سرّہ اللہ آگے ہوئے اور کہا عمر گوارا کر سکے گا کہ رسول اکرم صلی اللہ علی رسولہ وسلم سے کہے اے رسول اکرم صلی اللہ علی رسولہ وسلم اہل مکہ سے ملائمی و رحم کرو واللہ اگر اہل اسلام کو لکڑی کے ٹکڑوں کے سوا کوئی اور اسلحہ ہی ملے گا اسی کو لے کر مکّہ والوں سے لڑائی کے لئے ہماری آمادگی اور سعی ہوگی، اس سے سردار مکہ کو محسوس ہوا کہ معاہدہ صلح کی راہ مسدود ہے سو وہ معمورہ رسول سے،، دل مسوس کر کے،، محروم ہی لوٹا۔" (ہمدم عمر، صفحہ 76)

اگر غور کیا جائے تو یہ کام محض ایک ادبی چیلنج نہیں، بلکہ ایک علمی مشقت، لسانی مہارت، اور فکری ریاضت کا امتزاج ہے۔ اردو کے کل چھتیس حروفِ تہجی میں سے اکیس غیر منقوط حروف کو بروئے کار لاتے ہوئے 256 صفحات کی مکمل، ہم آہنگ اور مربوط المعانی کتب تحریر کرنا عام اہلِ قلم کے بس کی بات نہیں۔ یہ کارنامہ نہ صرف نثر نگاری میں انفرادیت رکھتا ہے بلکہ اردو ادب کی اس صنف میں ایک نئی راہ کھولنے کے مترادف ہے۔ مولانا محمد فاروق شاہین صاحب نے بے نقط نثر میں جس روانی، معنویت اور فکری گیرائی کا ثبوت دیا ہے، وہ ان کے عالی ذہن اور زبان پر عبور کی گواہی دیتا ہے۔ یہ تصانیف اس وقت علمی حلقوں میں نہ صرف قدر کی نگاہ سے دیکھی جا رہی ہیں بلکہ آئندہ اردو ادب کی فہرستِ نایاب میں ایک دلکش اضافہ ثابت ہوں گی۔ یقیناً جب بھی اردو ادب میں بے نقط نثر کا تذکرہ ہو گا، مولانا محمد فاروق شاہین کا نام اس فن کے نمائندہ اور نمایاں خدمت گار کے طور پر سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ مولانا موصوف کی علمی کاوشیں، تدریسی وابستگی، اور ادب اسلامی میں بے نقط تصانیف جیسے کارنامے اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ محض ایک مدرس یا خطیب نہیں بلکہ ایک ہمہ جہت عالمِ دین ہیں۔ اُن کی زندگی میں علم وعمل، ادب واخلاق، تواضع ووقار اور دینی غیرت کی حسین آمیزش ہے۔ خاص طور پر اُن کی تصانیف "ہمدم مکرم" اور "ہمدم عمر" نہ صرف اردو نثر کا نادر نمونہ ہیں بلکہ اسلامی سیرت نگاری میں بھی ایک نیاباب ہیں۔ ایسے علماء کی زندگیوں سے روشنی لینا وقت کی ضرورت ہے تاکہ ہماری نئی نسلیں شخصیت سازی، علمی محنت، اور دینی وفا شعاری کے اصل معانی سے واقف ہو سکیں۔ بلاشبہ مولانا موصوف کا یہ علمی وفکری سفر ابھی جاری ہے، اور آنے والے وقت میں ان سے مزید گراں قدر خدمات کی امید کی جا سکتی ہے۔

نوٹ: یہ دونوں غیر منقوط کتابیں حاصل کرنے کے لیے نیچے دیے گئے نمبر زپر رابطہ کریں:

0544277828 3075813350

یہاں دو مسئلے الگ الگ ہیں، بسا اوقات دونوں میں خلط ملط ہونے کے باعث غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں:

- ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ کیا جمعہ کے دن حلال کاروبار کرنا جائز ہے یا ناجائز۔
- اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ آج کل کی مروجہ ہفتہ وار سرکاری و غیر سرکاری سطح پر عام تعطیل کا انتظامی نظم جمعہ کے دن طے کیا جائے یا اتوار کو یا کسی اور دن۔

جمعہ کے دن خرید و فروخت کا حکم

پہلے مسئلے کا جواب واضح ہے کہ شریعتِ مطہرہ نے جمعہ یا کسی بھی دن حلال اور جائز کاروبار کرنے سے منع نہیں کیا، جب تک کہ کسی شرعی حکم کی خلاف ورزی لازم نہ آئے، چنانچہ جس طرح دوسرے دنوں میں شرعی احکام کو اپنے اپنے مقام پر بجالاتے ہوئے کاروبار کرنا جائز ہے، اسی طرح جمعہ کے دن بھی جائز ہے۔

البتہ جہاں جمعہ کی نماز قائم ہوتی ہے، وہاں جمعہ کی نماز کی اذان ہونے پر خرید و فروخت، بلکہ ہر وہ چیز ممنوع ہو جاتی ہے، جو جمعہ کی نماز کی تیاری میں داخل نہ ہو اور وہ خطبہ اور جمعہ کی نماز کی حاضری میں مخل ہو۔ اور اس کا صحیح انتظام جب ہو سکتا ہے کہ جب بازار اور دکانیں بند کر دی جائیں، کیونکہ اس طرح کرنے میں خریداری خود بخود بند ہو جائے گی، وجہ اس کی یہ ہے کہ گاہکوں اور خریداروں کا تو کوئی حد شمار نہیں ہوتا، ان سب کے روکنے کا انتظام آسان نہیں، لیکن فروخت کرنے والے دکاندار افراد خریداروں کے مقابلے میں محدود ہوتے ہیں، ان کو اشیا کے فروخت سے روک دیا جائے تو باقی سب خریداری سے خود رک جائیں گے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے سورہ جمعہ میں ”وذروا البیع“ یعنی ”تم فروخت چھوڑ دو“ میں صرف بیع چھوڑ دینے کے حکم پر اکتفا فرمایا، تاکہ فروخت کرنے والوں کے کاروبار بند کرنے سے خریداری خود بخود بند ہو جائے۔

پھر جب جمعہ کی نماز سے فارغ ہو جائیں، اس کے بعد پھر سے کاروباری مشاغل کو اللہ تعالیٰ نے جائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ:

یآیھا الذین آمنوا اذا نودی للصلوۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ وذروا البیع ذلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون۔ فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ واذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون۔ (سورۃ الجمعۃ الآیۃ ۹)

ترجمہ: اے ایمان والو! جب ندا دی جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن کی تو تم سعی کرو اللہ کے ذکر کی طرف اور چھوڑ دو بیع کو، یہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم رکھتے ہو علم، پھر جب پوری ہو چکے نماز تو تم منتشر ہو جاؤ زمین میں اور تلاش کرو اللہ کے فضل (یعنی روزی) کو اور ذکر کرو اللہ کا کثرت سے، تاکہ تم فلاح پاؤ۔

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت کی طرف سے انفرادی طور پر جمعہ کے دن اذان سے نمازِ جمعہ ختم ہونے تک خرید و فروخت ممنوع نہیں ہے۔

ہفتہ وار سرکاری و غیر سرکاری عام تعطیل

جہاں تک دوسرے مسئلہ کا تعلق ہے کہ آج کل کی مروجہ ہفتہ وار سرکاری و غیر سرکاری سطح پر عام تعطیل کا انتظامی نظم جمعہ کے دن طے کیا جائے یا اتوار کو یا کسی اور دن؟

تو اگرچہ شریعت نے ہفتہ وار چھٹی کو فرض اور واجب وغیرہ قرار نہیں دیا کہ اگر کوئی ہفتہ وار چھٹی نہ کرے تو وہ گناہ گار ہو، اس لیے فی نفسہ شرعاً ہفتہ کے تمام دنوں میں شرعی حدود میں رہتے ہوئے کاروباری سرگرمیاں جاری رکھنا جائز ہے۔

اور اسی وجہ سے اگر کسی ملک یا علاقہ میں ہفتہ میں سے کسی ایک دن بھی چھٹی کا نظم یا قانون نہ ہو تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، لیکن اگر ہفتہ وار چھٹی کا نظم بنایا جائے اور کسی وجہ سے اس کی ضرورت سمجھی جائے تو مسلمانوں کو ہفتہ وار عام تعطیل اور چھٹی کا جمعہ کے دن کرنا چند وجوہات کی بنا پر مستحب اور افضل ہے۔ اور وہ وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) جمعہ کا دن اس امت کے لیے خاص عبادت کا دن ہے، جو اس امت کو بطورِ خاص عطا ہوا ہے (جیسا کہ پہلے تفصیلاً ذکر ہو چکا ہے) لہٰذا اس دن میں دنیاوی مشغولیات کم کر کے عبادت کے لیے اپنے آپ کو فارغ کرنا چاہیے اور اس دن میں ہفتہ وار تعطیل اور چھوٹی ہونے سے اس مقصد کو بآسانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

(۲) جمعہ کی نماز کے لیے جلدی جانے کے احادیث میں بہت فضائل آئے ہیں اور ان فضائل کو حاصل کرنے کے لیے پہلے زمانے میں بہت سے حضرات صبح سویرے جامع مسجد پہنچ جایا کرتے تھے۔ اور احادیث میں بیان شدہ جمعہ کی

نماز کے لیے جلدی جانے کی فضیلت کا پہلا درجہ صبح سورج طلوع ہونے پر شروع ہو جاتا ہے اور اس فضلیت کو حاصل کرنا کم از کم مستحب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فضیلت کو حاصل کرنے کے لیے بھی صبح سے فراغت کی ضرورت ہوگی اور اس غرض کے لیے دوسرے مشاغل سے فارغ ہونا اور کاروباری چھٹی کرنا بھی مستحب ہوگا۔

(۳) جمعہ کے دن ایک گھڑی خاص قبولیت کی ہوتی ہے جس میں دعا قبول کی جاتی ہے اور یہ گھڑی کس وقت ہوتی ہے؟ اس بارے میں مختلف اقوال پائے جاتے ہیں، اگرچہ بعض حضرات کسی قول کو اور بعض نے دوسرے کسی قول کو ترجیح دی ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ تمام اقوال صبح سے لیکر سورج غروب ہونے کے وقت کے درمیان دائر ہیں۔ لہٰذا اس قبولیت کی گھڑی کو حاصل کرنے کے لیے بھی جمعہ کے دن کو دنیاوی مشغولیات سے فارغ رکھنے کی ضرورت ہوگی اور جمعہ کے دن تعطیل سے اس پر بآسانی عمل ہو سکتا ہے۔

(۴) جمعہ کے دن ہفتہ وار عام تعطیل ہونے میں اسلام اور مسلمانوں کی شان و شوکت کا اظہار ہے، وہ اس طرح سے کہ دوسرے مذاہب والے اپنے خاص عبادت و تعظیم والے دنوں میں ہفتہ وار عام تعطیل کر کے اس دن کی شرافت و کرامت کا اظہار کرتے ہیں، جب مسلمان جمعہ کے دن یہ عمل کریں گے تو دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں جمعہ کے اس عظمت و فضیلت والے اسلامی دن کی کرامت و شرافت کا اظہار ہوگا اور جمعہ کے دن کے عبادت و فضیلت والا دن ہونے کی عملی طور پر تبلیغ ہوگی۔

(۵) بعض احادیث میں جمعہ کے دن کو مسلمانوں کے لیے عید کا دن قرار دیا گیا ہے، لہٰذا عید کے دن جس طرح چھٹی کو ترجیح دی جاتی ہے، اسی طرح یہ دن بھی چھٹی کا مستحق ہے۔ کئی احادیث میں جمعہ کے دن کے بارے میں عید کا دن ہونے کا ذکر آیا ہے۔

(۶) بطورِ خاص ہمارے ملک پاکستان کے آئین کا تقاضا یہ ہے کہ ہفتہ یا اتوار کے بجائے جمعہ کے دن کی عام تعطیل کا نظم ہونا چاہیے، کیونکہ پاکستان کے آئین میں یہ صاف ذکر ہے کہ: مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ انفرادی یا اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق، جو قرآن مجید اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں متعیّن ہیں، ترتیب دے سکیں (''تصورِ پاکستان بانیانِ پاکستان کی نظر میں'' ۱۵۳)۔ اور ظاہر ہے کہ قرآن و سنت سے ثابت شدہ دلائل کا تقاضا ہفتہ یا اتوار کے دن چھٹی کا نہیں، بلکہ جمعہ کے دن چھٹی کا ہے۔

(۷) تجارت اور کاروبار میں مشغولی کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں مبتلا ہو کر انسان عموماً غافل ہو جاتا ہے اور مال و پیسہ کی کشش اس کو اپنے اندر ایسی منہمک کر دیتی ہے کہ اس کی وجہ سے جلدی جان نہیں چھوٹتی۔ تو اگر جمعہ کے دن کاروبار میں مشغولی رکھی جائے گی تو اس سے خطرہ ہے کہ جمعہ کی نماز تک یہ مشغولی جاری رہے اور جمعہ کی نماز کی سعی اور جمعہ کی نماز

کے خطبہ کے حصول میں بھی خلل آئے (جیسا کہ آجکل مشاہدہ ہے) اس کا تقاضا بھی یہ ہے کہ شروع دن ہی سے دنیاوی مشغولیات موقوف رکھی جائیں اور اس دن تعطیل کی جائے۔

(۸) اسلاف اور متقدمین سے بھی جمعہ کے دن کی چھٹی کا معمول ثابت ہے اور ان کی اتباع مستحب ہے۔ ان وجوہات کی بناء پر جمعہ کے دن چھٹی کرنا اور عبادت میں مشغول ہونا مستحب ہے۔ لیکن اگر کسی ملک وعلاقہ میں اتوار کے روز چھٹی کا نظم ہو اور اس کی وجہ سے کسی کو اتوار کے دن چھٹی کرنی پڑے اور اس کی نیت اتوار کے دن کی تعظیم کی نہ ہو، بلکہ انتظامی مجبوری اور ضرورت ہو، تو ایسا شخص مجبور ہے اور وہ گناہ گار بھی نہیں ہے۔

اتوار کے دن بین الاقوامی کاروبار کا معاملہ

آج کل اتوار کے دن چھٹی کرنے کے خواہش مند حضرات میں سے بعض لوگ ملکی سطح پر اتوار کے دن چھٹی کرنے پر اس لیے زور دیتے ہیں کہ اس دن عالمی منڈیاں خصوصاً مغربی ممالک کی مارکیٹیں بند رہتی ہیں، اس لیے بین الاقوامی سطح پر ان کے ساتھ اس دن کاروبار نہیں کیا جا سکتا اور اس کے برعکس جمعہ کے دن عالمی منڈیوں اور مارکیٹوں میں کاروبار جاری رہتا ہے، اس لیے اتوار کے بجائے جمعہ کے دن چھٹی کرنے میں ملک کو معاشی نقصان ہوتا ہے اور جمعہ کے بجائے اتوار کے دن چھٹی کرنے میں اس نقصان سے بچا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ

- اولاً تو ایک مسلمان اگر جمعہ کے دن کی چھٹی جمعہ کے دن عبادت اور اطاعت میں مشغولی کے باعث کرے اور اس دن میں عبادت و دعا وغیرہ میں مشغولی اختیار کرے تو اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کو اتنا رزق عطا فرمائیں گے، جس کا گمان بھی نہیں ہو سکتا۔
- دوسرے، مغربی ممالک سے سارا دن گزرنے کے بعد رابطہ ہوتا ہے، کیونکہ جب ہمارے ہاں صبح ہوتی ہے تو وہاں شام ہو جاتی ہے، اس لیے چھٹی کے اعتبار سے اتوار یا جمعہ دونوں دن برابر ہیں، لہٰذا یہ شبہ زیادہ وزنی معلوم نہیں ہوتا۔
- تیسرے، مسلمانوں کے دنیا میں بہت سے ممالک ہیں (اور بہت سے ملکوں میں جمعہ کے دن عام تعطیل بھی ہوتی ہے) اگر سب مسلمان باہم مل کر تجارتی و کاروباری معاملات چلائیں اور جمعہ کے دن چھٹی کریں اور اتوار کو کاروبار کریں تو مسلمان اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے غیر مسلموں سے زیادہ ترقی کر سکتے ہیں۔

جمعہ کا دن خرافات اور فضولیات کا نہیں

بعض لوگ جمعہ کے دن چھٹی ہونے میں یہ عذر پیش کیا کرتے ہیں کہ لوگ چھٹی کی وجہ سے اس دن کئی خرافات میں مبتلا ہو کر اس دن کی ناقدری کرتے ہیں، مگر یہ عذر تو ایسا ہے کہ جیسے کسی مسجد میں اہلِ علاقہ نماز پڑھنے میں کوتاہی کریں،

مسجد کو عبادت سے آباد نہ کریں، تو کوئی ''سمجھدار'' اس کا یہ حل تجویز کرے کہ مسجد کو گرا دو یا اس میں دکانیں بنا دو۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کو مسجد آباد کرنے پر راغب کرنا چاہیے، نہ کہ مسجد کی بندش کرنی چاہیے۔ اس لیے مسلمانوں کو اس طرزِ فکر سے باز آنا چاہیے، جمعہ کا دن خرافات اور فضولیات کا دن نہیں، بلکہ عبادت واطاعت کا دن ہے، جو اس امت کو بطورِ خاص عطا ہوا ہے، نہ یہ کہ الٹا جمعہ کے دن کی ناقدری کریں۔

خلاصہ یہ کہ فی نفسہ جمعہ کے دن کاروبار کرنا گناہ نہیں، لیکن اگر ہفتہ وار تعطیل اور چھٹی کرنی ہو تو اس کے لیے جمعہ کا دن منتخب کرنا مستحب اور افضل ہے، تاکہ مسلمان اس دن زیادہ سے زیادہ عبادت کر کے اس دن کے فضائل سے فائدہ اُٹھا سکیں اور اس دن کے عظمت وفضیلت والا ہونے کا اظہار کر سکیں، نہ یہ کہ اس وجہ سے کہ کاروباری مشاغل سے فارغ رہ کر اس دن کو فضولیات وخرافات اور منکرات وگناہوں کی نذر کریں۔

جمعہ کے دن کی چھٹی اہلِ علم کی نظر میں

بہت سے اہلِ علم حضرات نے جمعہ کے دن چھٹی کی تحسین وتصویب فرمائی ہے۔

چنانچہ کفایت المفتی میں ہے کہ:

> اگر وہ جمعہ کی اذان سے پہلے کاروبار کو ناجائز نہ سمجھتے ہوں، بلکہ باوجود جائز اور حلال سمجھنے کے محض انتظام، ضروریاتِ نماز کے خیال سے دکانیں بند رکھیں، کیونکہ غسل وغیرہ کے لیے اور نمازِ جمعہ میں تبکیر یعنی جلدی سے حاضری کے واسطے اس صورت میں آسانی ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بلکہ موجبِ اجر ہے۔ (کفایت المفتی مبوب جلد ۳ صفحہ ۲۸۵)

اور فتاوی محمودیہ میں ہے کہ:

> اتوار کے دن تعطیل کرنے میں تشبہ ہے غیروں کے ساتھ، دینی مدرسہ میں اس کو ہرگز اختیار نہ کیا جائے۔ (فتاوی محمودیہ مبوب جلد ۸ صفحہ ۳۶۳، باب صلاۃ الجمعۃ)

اور حیاتِ ترمذی میں ہے کہ:

> جمعہ کے دن جامع مسجد میں بہت جلدی جانا اور صبح سے ہی وہاں پہنچنا شرعاً مستحب اور قربت ہے۔ حدیث شریف میں اس کا ثواب بتلا کر اس کی ترغیب اور فضیلت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے آدابِ جمعہ میں فرمایا ہے: الرابع: البکور إلی الجامع ۔۔۔۔۔ ویدخل وقت البکور بطلوع الفجر وفضل البکور عظیم۔ (شرح الاحیاء ج ۳ ص ۲۴۵)

جب صبح صادق سے ہی جامع مسجد میں جانا باعثِ ثواب اور موجبِ قربت ہے تو پھر جمعہ کے دن کاروبار بند کر کے ہی یہ فضیلت حاصل کی جا سکتی ہے اور عام تعطیل کر کے ہی تبکیرِ مستحب اور سویرے جانے پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

اس لیے امام غزالی رحمہ اللہ نے ایسے تمام اشغال اور کاموں سے فارغ رہنے کو آدابِ جمعہ میں شمار فرمایا ہے، جن میں مشغول ہو کر جمعہ میں سویرے جانے کی فضیلت حاصل کرنے میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: ویفرغ قلبہ من الأشغال التی تمنعہ من البکور إلی الجمعۃ۔ (شرح الاحیاء ج ۳ ص ۲۷۰)

تبکیرِ مستحب کے بھی اگرچہ درجات ہیں اور ہر درجے کا علیحدہ ثواب وارد ہوا ہے، مگر افضل درجہ صبح کے وقت جامع مسجد جانا ہی ہے اور یہ درجہ کاروبار اور اشغال دنیا میں مصروفیت کے ساتھ حاصل نہیں ہو سکتا، اس لیے جمعہ کے دن صبح سے ہی تعطیل عام اور کاروبار بند کرنا مستحب ہوگا۔

البتہ اذانِ جمعہ کے بعد کاروبار بند کرنا لازم اور واجب ہوگا، جس کا آیت جمعہ میں ذکر ہے اور شریعت کا مشہور حکم ہے، مگر اذانِ جمعہ کے بعد کاروبار بند ہونے کے وجوبی حکم سے یہ سمجھنا درست نہیں کہ اذان سے قبل کاروبار کرنا واجب ہے اور یہ کہ کاروبار بند کرنا مستحب بھی نہیں ہے۔ ایسا سمجھنا حدیث تبکیر الی الجمعۃ (یعنی جمعہ کے دن جلدی اور سویرے جانے) کے خلاف ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اذانِ جمعہ کے بعد تو کاروبار بند کرنا واجب ہے، اور اذانِ جمعہ سے قبل اگرچہ وجوبی حکم نہیں ہے لیکن اس کا استحبابی حکم اوپر ثابت کر دیا گیا ہے، اس لیے اگر اذانِ جمعہ کے قبل استحبابی حکم سمجھ کر تعطیل کی جائیگی تو درست ہے۔

تحریر بالا سے واضح ہو گیا ہوگا کہ اذانِ جمعہ سے قبل کی تعطیل بدعت اور گناہ اور شریعت کے خلاف نہیں ہے، بلکہ یہ ایک مستحب اور کارِ ثواب ہے، گو واجب بھی نہیں ہے، واجب صرف اذانِ جمعہ کے بعد نمازِ جمعہ سے فارغ ہونے تک ہے۔ فقط واللہ اعلم، سید عبد الشکور ترمذی عفی عنہ، ساہیوال ضلع سرگودھا، ۱۸ صفر المظفر ۱۳۹۹ھ (حیاتِ ترمذی صفحہ ۴۰۷ و صفحہ ۴۰۸)

مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے عربی میں ایک سوال کے جواب میں جمعہ کے دن تدریس سے تعطیل کو مستحب اور سنت مسلوکہ للسلف الصالحین قرار دیا ہے اور اس کی وجہ یہ فرمائی ہے "لتفردہم فی ہذا الیوم للعبادۃ ولکونہ یوم عیدنا" (ملاحظہ ہو: امداد المفتیین صفحہ ۴۰۵، ۴۰۶)

اور ''آپ کے مسائل اور ان کا حل'' میں ہے کہ:

چھٹی تو جمعہ کے دن ہی کی ہونی چاہیے (اگر ہفتہ میں ایک دن کی چھٹی ضروری ہو)، رہا یہ کہ لوگ اس مقدس دن کو لغویات میں گزارتے ہیں، اس کے لیے ان لغویات پر پابندی ہونی چاہیے اور جو لوگ ان لغویات میں مبتلا ہو کر جمعہ کی نماز میں کوتاہی کرتے ہیں، اُن کو اپنے دین وایمان کی خیر منانی چاہیے (آپ کے مسائل اور ان کا حل جلد ۸ صفحہ ۴۱۴)

اور انعام الباری میں ہے کہ:

اگر ہفتے میں کسی بھی دن چھٹی کرنی ہے تو جمعہ کا دن زیادہ مستحق ہے، اس لیے کہ چھٹی کی وجہ سے اس دن کو زیادہ سے زیادہ عبادت میں خرچ کرنے کا موقع ہوگا۔ اگر اس دن کو کام کا دن بنایا تو پھر عبادت کا موقع کم ہوگا، لہٰذا مقصد فوت ہو جائے گا۔ جمعہ کے علاوہ اتوار کو چھٹی کرنے میں دوسری خرابی یہ بھی ہے کہ اس میں ایک غیر قوم کی نقالی کا شبہ ہے۔ (انعام الباری جلد ۴ صفحہ ۴۱)

اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو جمعہ کے دن کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(المستفاد، جمعہ مبارکہ کے فضائل واحکام، مؤلف مولانا رضوان صاحب، ص: ۳۱۲-۳۲۲/ط: ادارہ غفران، راولپنڈی)

The household of Prophet Muhammad (peace be upon him) began with his marriage to Ummul-Mumineen Khadijah al-Kubra (may Allah be pleased with her). While residing in Makkah, the Prophet (peace be upon him) did not marry another woman during her lifetime. He was twenty-five years old at the time of their marriage, and they remained together for twenty-five years. Khadijah (may Allah be pleased with her) passed away in the eleventh year of Prophethood.

She was the Prophet's first wife and the mother of his children. All of his offspring—except for Ibrahim (may Allah be pleased with him)—were born to Ummul-Mumineen Khadijah. These included four daughters and three to five sons, according to differing narrations. Qasim (may Allah be pleased with him) reportedly lived nearly to adolescence, rode horses by the age of thirteen or fourteen, and passed away. Due to him, the Prophet (peace be upon him) was called "Abul Qasim." Other sons named include Abdullah, Tahir, and Tayyib, though none reached adulthood. His daughters grew up, were married, and had children. The Prophet (peace be upon him) lovingly raised his daughters and even cared for their children. Though he had no biological grandson, he raised one as if he were: Usamah ibn Zayd (may Allah be pleased with him) was nurtured in the Prophet's care and received love like a grandson.

Speaking of Ummul-Mumineen Khadijah al-Kubra (may Allah be pleased with her), the marital love and bond between her and the Prophet (peace be upon him) is a timeless example for the entire world. She was a prominent and wealthy woman of Makkah, and she spent all her wealth in the service of the Prophet (peace be upon him). He used to say he could never forget the kindness of two individuals who sacrificed everything for him—among men, Abu Bakr (may Allah be pleased with him), and among women, Ummul-Mumineen Khadijah (may

Allah be pleased with her).

When the Angel Jibreel (Gabriel, peace be upon him) brought the first revelation in the Cave of Hira, it was a sudden experience for the Prophet (peace be upon him). He accepted the divine message, but the extraordinary nature of the event weighed heavily on him. After the revelation, he returned home and shared the experience with Ummul-Mumineen Khadijah (may Allah be pleased with her). She is the noble wife of the Prophet (peace be upon him) and remains a revered mother of Muslims until the Day of Judgment. The Prophet (peace be upon him) said Khadijah (may Allah be pleased with her) was the most generous woman toward him personally. She was highly intelligent and deeply understanding. Upon hearing what had happened in the cave, and noticing his natural concern, her first response was: By Allah, He will never disgrace you. She reassured him that Allah would never abandon him. She explained: انک لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم و تقری الضیف و تعین علیٰ نوائب الحق You uphold family ties, support the helpless, provide for the needy, host guests with generosity, and aid those facing hardship in the path of truth.

In essence, Allah does not forsake someone who serves society and supports the vulnerable. The Prophet's earliest public recognition came as someone who helped widows, orphans, and the impoverished. Social service is a right of society, and the Prophet (peace be upon him) fulfilled this duty himself while also teaching it to others.

Ummul-Mumineen Khadijah (may Allah be pleased with her) always remained close to the Prophet's heart. She passed away in Makkah during the eleventh year of Prophethood. After migrating to Madinah, the Prophet (peace be upon him) entered into other marriages. Among them, Ummul-Mumineen Aisha (may Allah be pleased with her) was the most beloved. She was the daughter of Abu Bakr (may Allah be pleased with him), a woman of brilliant intellect, and was blessed with many virtues by Allah. Though she had many co-wives, the Prophet (peace be upon him) had nine at one time, she confessed feeling strongest jealousy not toward any living companion, but whenever the Prophet frequently spoke about Khadijah (may Allah be pleased with her): "Khadijah was like this," "Khadijah did that." According to a narration in Sahih Bukhari, Ummul-Mumineen Aisha (may Allah be pleased with her) once said: O Messenger of Allah, do you never forget that old woman? Allah has granted you better wives now. To which the Prophet (peace be upon him) replied: Aisha, she was my companion in hardship. A companion in hardship is never forgotten. How can I forget the time of trials, pain, and adversity?

The deaths of Khadijah (may Allah be pleased with her) and the Prophet's uncle Abu Talib occurred around the same time. At home, Khadijah was the greatest support, and outside the home, it was Abu Talib. Though he did not accept Islam, history attests that he fully upheld his role as an uncle and protector. He even stood with the Prophet (peace be upon him) during the siege of Sha'b Abu Talib. While Abu Talib was alive, no one dared confront the Prophet directly; any complaints were addressed to him. His presence carried weight. The year in which both Abu Talib and Khadijah passed away was extremely sorrowful for the Prophet (peace be upon him), as he lost two of his greatest worldly supporters. He declared that year عام الحزن (the year of sorrow).